نومبر ۸۸ء

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

شاعت خصوصی : اقبال نمبر

مقالات پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

- حیات و سیرت اقبال ـــــ ایک اجمالی خاکہ
- فلسفہ اقبال ـــــ ایک اجمالی خاکہ
- ملت اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام
  خلاصہ رموز بے خودی

مقالہ سید نذیر نیازی مرحوم

- اقبال اور قرآن

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ۷ | نومبر ۱۹۸۸ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ | شمارہ: ۱۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ واؤ منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: ۴۰ روپے فی شمارہ: ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

اِنْ شَاءَ اللّٰہُ الْعَزِیْزُ وبعونہ تعالیٰ

انجمن خدام القرآن سندھ کراچی

کے زیر اہتمام

۱۷ تا ۲۱ دسمبر ۸۸ء نیکس آڈیٹوریم صدر کراچی میں

اسلام کا نظامِ حیات

کے موضوع پر محاضراتِ قرآنی منعقد ہوں گے جن میں روزانہ بعد نمازِ مغرب

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ـــــ وامیر تنظیمِ اسلامی

● اسلامی نظام کی نظریاتی اساس

● اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام ● اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام

● اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام اور ● اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام

کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے اور متعلقہ سوالات کے جواب دیں گے

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"

المعلن: (سید) سراج الحق، صدر انجمن خدام القرآن سندھ

D-56، بلاک بی، نارتھ ناظم آباد، کراچی (فون: ۶۲۴۴۵۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

حسبِ اعلان 'حکمتِ قرآن' کا زیرِ نظر شمارہ حکیم الامّت علامہ اقبالؔ مرحوم کے حوالے سے ایک خصوصی اشاعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبالؔ کو قرآن حکیم کے ساتھ جو خصوصی تعلق بلکہ نسبتِ خصوصی حاصل تھی اور انہوں نے اپنے کلام میں جس خوبصورتی سے قرآن حکیم کے حِکَم و معارف کو سمویا ہے کہ خود انہی کے بقول ع "گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام" اس کے پیشِ نظر انہیں بجا طور پر اس دَور کا 'ترجمان القرآن' قرار دیا جاتا ہے۔ ہماری دانست میں وہ محض ترجمانِ قرآن ہی نہیں، داعیِ قرآن تھے۔ امت کی شیرازہ بندی اور اسے قرآن کے کھونٹے سے باندھنا اُن کے نزدیک سازو سخن کا اصل مقصود تھا چنانچہ ایک جانب وہ اپنی شعر گوئی کا مقصد ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

تو دوسری جانب امت کو قرآن سے وابستہ ہونے کی تاکید ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ؎

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

یہی وجہ ہے کہ "حکمتِ قرآن" کے صفحات میں اقبالؔ کے افکار اور ان کے پیام کو خصوصی جگہ دی جاتی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں علامہ اور اُن کے کلام کے بارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے جو چار مضامین شامل کیے گئے ہیں اُن میں سے بعض کا خصوصی معاملہ یہ ہے کہ وہ علامہ کی زندگی ہی میں رقم کیے گئے تھے۔ یہ مضامین 'اقبال کے پیغام اور فلسفے کی تفہیم میں کلید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چشتی صاحب کے مضامین کے علاوہ سید نذیر نیازی کا ایک اہم مضمون 'اقبال اور قرآن'

(باقی صفحہ ۴ پر)

تعارف

اسرار احمد

(شائع شدہ: "میثاق" بابت مئی ۱۹۶۹ء)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع مسلسل ملتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ علامہ اقبال مرحوم بقیدِ حیات ہی تھے پروفیسر صاحب نے "اقبال کا پیغام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ابتداءً علامہ کے سوانح حیات اور ان کی سیرت کا ایک اجمالی خاکہ دیا گیا تھا اور پھر علامہ کے فلسفے کے اجمالی تعارف کے لیے اوّلاً ان کی اس تحریر کا ترجمہ کیا گیا تھا جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفیانہ افکار کی وضاحت کے لیے خود لکھی تھی اور ثانیاً 'پیغام اقبال' کے مختصر لیکن جامع تعارف کے طور پر 'مثنوی اسرار و رموز' کے مباحث کا خلاصہ مرتب کیا گیا تھا ——— پروفیسر صاحب کی اَن گنت تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی مسودات کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب اپنے کسی اور مضمون کی تلاش میں مسودات کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ اتفاقاً یہ سامنے آگئی جو انہوں نے راقم کو مرحمت فرما دی۔ اور اس طرح اب قارئین 'میثاق' کی خدمت میں پیش ہے۔

اس تحریر کا اصل حصّہ جو علامہ مرحوم کے فلسفیانہ افکار اور ان کے اس پیغام پر مشتمل ہے جو انہوں نے ملّتِ اسلامی کو دیا ہے وہ تو آئندہ شائع ہوگا۔ اس ماہ حیات و سیرت اقبالؒ کا اجمالی خاکہ پیشِ خدمت ہے۔ علامہ مرحوم کی زندگی پر بہت مفصّل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور

ان کی زندگی کے اہم واقعات تو اکثر لوگوں کے ذہن میں ویسے بھی محفوظ ہیں، تاہم اس اعتبار سے یہ تحریر بہت دلچسپ اور قدرے منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ یہ علاّمہ کی زندگی ہی میں ان کے ایک حلقہ بگوش اور عقیدت مند کے قلم سے نکلی تھی اور انشاء اللہ قارئین میثاق، میں سے وہ حضرات بھی اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے جو علاّمہ مرحوم کے حالات زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ خود علاّمہ مرحوم کے علاوہ ان کے والد ماجد، اساتذہ کرام اور ہم عصر مفکرین پر جو نوٹ ضمناً اس مضمون میں آ گئے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور ان سے اس مضمون کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ امر ذہن میں مستحضر رکھا جائے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ بہت سی باتیں جو اس مضمون میں بصیغۂ حال بیان ہوئی ہیں کب کی قصّۂ ماضی بن چکیں۔ چنانچہ کہیں کہیں انسان ایک دم چونک سا جاتا ہے ——— اس میں بھی ایک خزانہ عبرت پنہاں ہے ع

"جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہو گا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!"

★★

بقیہ: حرفِ اوّل

بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے جو اپنے موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور چونکہ یہ مضمون 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' نامی کتابچے کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے، لہٰذا 'دعوت رجوع القرآن' کے اُس کام سے بھی اس کی خصوصی نسبت بنتی ہے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے پیش نظر ہے۔

★

حیات و سیرتِ اقبال

ایک اجمالی خاکہ

علاّمۃ العصر ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ سر محمّد اقبال مدظلہٗ کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے جن کی گوت "سپرو" تھی۔ وہ ایک باکمال ولی اللہ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوتے تھے اور اس ولی کا رُوحانی تصرف آج تک ان کے خاندان میں چلا آتا ہے اور وہ حسنِ عقیدت جس نے سپرو کو شیخ بنا دیا ہنوز تازہ ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اِسی لیے اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں دونوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہے چنانچہ ان کے کلام میں دونوں کے متعلق رموز و نکات موجود ہیں۔ مثلاً:

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے

ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوتے تھے۔ والدین نے اقبال نام رکھا[1]۔ میرا خیال ہے اس وقت کس کو یہ خیال ہو گا کہ آئندہ چل کر یہ لڑکا واقعی صاحب اقبال ہو گا۔ اور ایک مثنوی ایسی لکھ کر دنیا کو دے جائے گا، جس کی قدر و قیمت قیامت تک باقی رہے گی۔

ابتداءً مکتب میں داخل ہوتے اس کے بعد سکول میں نام لکھایا اور مشن ہائی سکول سیالکوٹ

---

[1] حاشیے کے لیے ص۵۱ ملاحظہ فرمایئے، قارئین کی سہولت کے پیش نظر تمام حواشی مضامین کے اختتام پر جمع کر دیئے گئے ہیں۔

سے میٹرک پاس کر کے مقامی (مرے کالج) میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب[2] کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ استاد کو جوہر قابل ہاتھ لگ گیا۔ فیضِ صحبت سے چمکا دیا، ادب اور شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کا ملکہ فطری طور پر ودیعت شدہ تھا لیکن مولانا کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

غالباً شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ افسوس کہ ابتدائی کلام النّادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ فلسفہ اور عربی لے کر بی اے پاس کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ علاّمہ موصوف شروع سے آخر تک ہم چشموں میں معرُوف اور ممتاز رہے۔

اسی سال آپ اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لیکچرار مقرر ہوئے دوسرے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔

جس طرح ابتدا میں مولانا میر حسن نے، اسی طرح طالب علمی کے آخری دَور میں ڈاکٹر آرنلڈ[3] کی صحبت نے آپ کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا اور سونے کو کندن بنا دیا۔ پہلے شاگردی تھی کچھ عرصہ کے بعد دوستی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو مدۃ العمر باقی رہا۔ آرنلڈ اپنے شاگرد کی جودتِ طبع کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ "جس استاد کو اقبال سا شاگرد میسّر آجائے، وہ رفتہ رفتہ محقق بن جاتا ہے۔"

ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی آپ کے مطالعہ اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اور زیادتی ہو گئی۔ اسی اثنا میں آپ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے[4]۔ کیمبرج سے فلسفہ اخلاق میں ڈگری لی۔ اس کے بعد میونخ سے DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA لکھنے پر

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر لندن واپس آئے۔ بیرسٹری پاس کی اور ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

تین سال قیام کرنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ شام کی گاڑی سے لاہور واپس آئے۔ دَورانِ قیام انگلستان میں آپ کو مشاہیر علماً اور فضلاً کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ ان میں کیمبرج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ[5]، ڈاکٹر براؤن[6]، ڈاکٹر نکلسن[7] اور ڈاکٹر سارلے[8] خصوصیّت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

کچھ دن وطن میں قیام کرنے کے بعد آپ نے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ پہلے انارکلی میں رہائش تھی۔ اب ایک عرصہ سے میکلوڈ روڈ پر قیام[9] ہے۔ اقبال کی وجہ سے مجھے اس سڑک سے وہی وابستگی ہے۔ جو مجنوں کو کوئے لیلیٰ سے تھی۔

۱۹۳۳ء میں جاوید منزل ——————— ۱۹۳۸ء میں وفات

اگرچہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء سے پریکٹس کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اس پیشہ سے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جو شخص دن رات کسی دوسرے عالم میں رہتا ہو اور شاعرانہ دل و دماغ، فلسفیانہ مزاج، صوفیانہ افتادِ طبع اور عالمانہ طرزِ زندگی رکھتا ہو، جو VISIONARY IDEALIST ہو۔ جس کی توجہ تمام تر ملّتِ اسلامیہ کی بہبُود پر مبذول رہتی ہو۔ جس کے دل میں قوم کا درد رہ رہ کر چٹکیاں لیتا ہو جو سراپا سوز و گداز ہو جس کا بہت سا وقت EGO اور REALITY کے متعلق غور و فکر میں بسر ہوتا ہو۔ جو اسرارِ خودی کا مصنّف ہو اسے "نظارۂ دیوانی" اور "امثلۂ فوجداری" سے کیا خاک دلچسپی ہو سکتی ہے؟

۱۹۲۳ء میں سرکار برطانیہ نے آپ کو SIR کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی خطابات یا اعزازات کے لیے خواہش یا کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس خطاب کو کسی خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی دوسری دنیا

میں رہتے ہیں جہاں SIR اور SERVANT دونوں یکساں نظر آتے ہیں ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اقبال کی شاعری

یوں تو شاعر، ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر آتا ہے لیکن جس وقت یہ ملکہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے شاعر کی شاعری کا آغاز تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۵ء سے سمجھنا چاہیے۔ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے آپ کی سخن گوئی صرف احباب اور کالج کے طلبہ تک محدود تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں آپ نے جلسوں میں شرکت شروع کی اور اس طرح آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ عام ہونے لگا۔

غالباً دوستوں نے مشورہ دیا ہوگا کہ آپ کو کسی باکمال استاد سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ استاد بہر حال، خوب کو خوب تر بنا دیتا ہے یا آپ نے خود اس ضرورت کو محسوس کیا ہوگا۔ بہر کیف آپ نے بلبل ہند نواب فصیح الملک بہادر، مرزا داغ دہلوی، استاد اعلیٰ حضرت نظام دکن مرحوم کو خط لکھا کہ مجھے اپنی سلک شاگردی میں منسلک کر لیجئے اور چند غزلیں بھی اصلاح کے لیے بھیجیں۔

تلمذ کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ ہاں بقول آنریبل جسٹس شیخ سر عبدالقادر صاحب بالقابہ" اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی"۔ اقبال کی خوش نصیبی کہ اُسے داغ جیسا زبان دان اور کامل الفن استاد ملا۔ اور داغ کی بلند بختی کہ اقبال اس کے شاگردوں کی ممتاز صف میں شامل ہوا۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے۔"

اقبال نے خود بھی ایک غزل کے مقطع میں، داغ کے شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

سب سے پہلے لاہور میں، سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے:-

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو شعراء قوموں کو زمزمہ حیات سنانے آتے ہیں وہ مکانی اور زمانی دونوں قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ اقبال نے رفتہ رفتہ اپنی طرز وہی کر لی جو اُن کے لیے مناسب تھی۔ یعنی ۱۹۱۱ء سے اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہوگئی۔ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں آپ نے "خون شہداء کی نذر" کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس نے ایک قیامت برپا کر دی۔ جس وقت آپ نے یہ شعر پڑھا۔

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مسجد میں کہرام مچ گیا تھا۔ آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد۔ والا مضمون ہے ہر آئینہ نظم سوز درونی کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کی سیرت

علامہ موصوف کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا بارہا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس لیے جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ان سے مل کر جو نقوش دل پر جم چکے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہوں۔

پہلی بات جو ہر شخص کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی عدیم النظیر سادگی ہے۔ سادہ لباس، سادہ رہائش، سادہ زندگی، سادہ گفتگو غرضیکہ ہر بات سے سادگی ٹپکتی ہے۔ لیکن دماغ ہر وقت آسمان کے تارے توڑ کر لاتا رہتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں (PLAIN LIVING

AND HIGH THINKING)

دوسری بات یہ ہے کہ علاّمہ کا درِ فیض ہر کس و ناکس کے لیے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر نائٹوں اور خان بہادروں کو بآسانی باریابی ہو جاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک السلام علیکم کہہ کر خوانِ علم و فضل کی زلہ ربائی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاغنڈا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملّتِ اسلامیہ کی بہبود کی تدبیر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ ع

شہرتِ شعرش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکارِ دو عالمؐ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی "گیسو دراز" میں دیکھی نہیں!!!

یوں تو ہر شاعر پر کیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوزِ عشقِ مصطفےٰؐ سے مالامال ہیں اسی لیے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حُبِّ رسولؐ کے لیے نہ ٹخنوں سے اُونچا پاجامہ چاہیے نہ طویل اللحیہ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف دردآشنا دل درکار ہے۔[۱۱]

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک مفکر کے لیے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علاّمہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ

کی پرستش کرتا انہوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذباتِ محبّت کی قدرے ترجمانی کرتا ہے۔

علاّمہ کی تصنیفات

(۱)	علم الاقتصاد	اُردو	نایاب ہے۔
۲-	فلسفہ ایران	انگریزی	مل سکتی ہے
۳-	اسرارِ خودی	فارسی	〃 〃 〃
۴-	رموزِ بے خودی	〃	〃 〃 〃
۵-	پیامِ مشرق	〃	〃 〃 〃
۶-	زبورِ عجم	〃	〃 〃 〃
۷-	لکچرز مدراس	انگریزی	〃 〃 〃
۸-	جاوید نامہ	فارسی	〃 〃 〃
۹-	بانگِ درا	اُردو	〃 〃 〃
۱۰-	بالِ جبریل	〃	〃 〃 〃
۱۱-	ضربِ کلیم	〃	〃 〃 〃
۱۲-	مسافر	فارسی	〃 〃 〃
۱۳-	"پس چہ باید کرد"	〃	〃 〃 〃
۱۴-	ارمغانِ حجاز	فارسی و اُردو	〃 〃 〃

قدردانی

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ شعراء، حکماء، فلاسفہ کی قدر اُن کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن اقبال

AND HIGH THINKING)

دوسری بات یہ ہے کہ علاّمہ کا در فیض ہر کس و ناکس کے لیے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر نائٹوں اور خان بہادروں کو بآسانی باریابی ہو جاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک السلام علیکم کہہ کر خوان علم و فضل کی زلہ ربائی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاغنڈا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملّتِ اسلامیہ کی بہبود کی تدبیر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ ع

شہرت شعرش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکار دو عالمؐ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی "گیسو دراز" میں دیکھی نہیں!!!

یوں تو ہر شاعر پر کیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوزِ عشق مصطفےٰؐ سے مالامال ہیں اسی لیے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حُبّ رسولؐ کے لیے نہ ٹخنوں سے اُونچا پاجامہ چاہیے نہ طویل اللحیّہ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف درد آشنا دل درکار ہے۔[۱۱]

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک مفکر کے لیے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علاّمہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ

کی پرستش کرتا انہوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذبات محبّت کی قدرے ترجمانی کرتا ہے۔

علاّمہ کی تصنیفات

(۱)	علم الاقتصاد	اُردو	نایاب ہے۔
۲-	فلسفہ ایران	انگریزی	مل سکتی ہے
۳-	اسرارِ خودی	فارسی	" " "
۴-	رموزِ بے خودی	"	" " "
۵-	پیامِ مشرق	"	" " "
۶-	زبورِ عجم	"	" " "
۷-	لکچرز مدراس	انگریزی	" " "
۸-	جاوید نامہ	فارسی	" " "
۹-	بانگِ درا	اُردو	" " "
۱۰-	بالِ جبریل	"	" " "
۱۱-	ضربِ کلیم	"	" " "
۱۲-	مسافر	فارسی	" " "
۱۳-	"پس چہ باید کرد"	"	" " "
۱۴-	ارمغان حجاز	فارسی و اُردو	" " "

قدردانی

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ شعراء، حکماء، فلاسفہ کی قدر اُن کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن اقبال

کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں کافی ہو چکی ہے۔

(۱) ترکی زبان میں عربی زبان میں اور انگریزی زبان میں ان کی بہت سی نظموں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن نے اسرارِ خودی کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ کئی جرمن علمائے علامہ کے کلام اور فلسفہ پر تبصرہ جرمن زبان میں شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانوں میں، ان کے فلسفہ پر محققانہ مضامین لکھے گئے ہیں۔

(میثاق مئی ۱۹۶۹ء)

★

مستقل خریدار توجّہ فرمائیں

- پرچے کے لفافے پر مندرج اپنا خریداری نمبر نوٹ کر لیجئے بلکہ یاد کر لیجئے اور خط و کتابت کرتے وقت اس کا حوالہ ضرور دیجئے۔
- خصوصاً اگر آپ پرچہ کی عدم وصولی کی شکایت کر رہے ہیں تو خریداری نمبر کا حوالہ اشد ضروری ہے۔
- بدلِ اشتراک روانہ کرتے وقت بھی خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔
- بدلِ اشتراک کسی ذاتی نام کی بجائے مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن کے نام روانہ کیجئے۔

(ادارہ)

فلسفۂ اقبال

'میثاق' جون ۱۹۶۹ء

علامہ اقبال مرحوم بلاشبہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ ان کے فلسفہ کو عام طور پر "فلسفۂ خودی" کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ ان کا اصل فلسفہ ہے کیا:

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ علامہ کی معرکۃ الآرا مثنوی "اسرارِ خودی" کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا ہے۔ لیکن یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ پروفیسر موصوف نے خود "اسرارِ خودی" کو سمجھنے کے لیے اوّلاً ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم سے مدد لی جو اس وقت کیمبرج میں اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے (یہ ذکر ۱۹۱۸ء کا ہے) اور پھر جب اس ساری تگ و دو کے باوجود وہ علامہ مرحوم کے فلسفہ کو اچھی طرح نہ سمجھ پائے تو انہوں نے خود علامہ سے رجوع کیا اور فرمائش کی کہ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبان انگریزی تحریر کر دیں۔ علامہ نے اس فرمائش کی تعمیل میں جو مضمون لکھا اسے پروفیسر نکلسن نے SECRETS OF THE SELF کے شروع میں شامل بھی کر دیا جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

ذیل میں ایک تو اس تحریر کا وہ ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر چشتی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں کیا تھا اور دوسرے مثنوی اسرارِ خودی کا وہ خلاصہ بھی درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں خود مرتب کیا تھا۔

اس طرح یہ مضمون علامہ اقبال مرحوم کے فلسفے پر نہایت مختصر لیکن انتہائی جامع اور ساتھ ہی غایت درجہ عام فہم دستاویز کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا انداز تمام تر معروضی ہے اور اس کے ذریعے علامہ مرحوم کے فلسفہ کو جیسا کچھ وہ ہے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے ——— اس لیے اس میں کسی جگہ بھی اختلاف یا اتفاق کا اظہار نہیں کیا گیا ———!!

آئندہ شمارے میں انشاء اللہ "رموز بے خودی" کا خلاصہ بھی شائع کر دیا جائے گا۔ یہ بھی پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں مرتب کیا تھا۔ اس طرح اس پیغام کا خلاصہ بھی سامنے آجائے گا جو علامہ مرحوم نے اُمّت مسلمہ کو دیا تھا اور یہ تینوں مضمون مل کر ایک مکمل وحدت کی صورت اختیار کرلیں گے ——— واضح رہے کہ 'رموز بے خودی' کا ترجمہ بعد میں پروفیسر آربری نے کیا جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ——— اسرار احمد

(۱)

اقبال کے فلسفہ کا اجمالی خاکہ

جو انہوں نے نکلسن کی فرمائش پر خود تحریر فرمایا

ترجمہ : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے۔ خود خدا بھی اک فرد ہے۔ اگرچہ فرد کامل ہے۔ کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس مجموعہ میں جو نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے وہ بذاتہٖ کامل نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلّی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر بدنظمی اور انتشار سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ افرادِ کائنات کی تعداد معیّن نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یعنی کائنات فعل مختتم نہیں ہے۔ ہنوز مراتب تکمیل طے کر رہی ہے اسی لیے اس کے متعلق کوئی بات حتمی اور اذعانی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ فعل تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس

کائنات کے کسی غیر مربوط حصّہ میں ربط و ترتیب پیدا کر سکتا ہے اس حد تک اس کو بھی فعل تخلیق میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں: "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"۔

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور ارباب وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیات کلّی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی مٹا دے۔

میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: "تخلّقوا باخلاق اللہ" یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرو۔ پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہو گا۔ اسی قدر اس کے اندر شان یکتائی اور رنگ انفرادیت پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حیات کیا ہے؟ فرد کا دوسرا نام حیات ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت، جو اس وقت تک معلوم ہو سکی ہے خودی (EGO) ہے۔ اگرچہ جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے لیکن ابھی تک فرد کامل کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ فرد جس قدر خدا سے قریب ہو گا۔ اسی قدر کامل ہو گا۔ قرب الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے، بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرلے۔ حیات دراصل اک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے۔ جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان پر غلبہ پا کر آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا خاصہ یا جوہر طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اپنی حفاظت اور ترقی کے لیے اس نے آلات اور وسائل پیدا کر لیے ہیں۔ مثلاً حواس اور ادراک جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتی ہے۔ مادہ حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن مادہ کوئی بُری چیز نہیں ——— بلکہ حیات

کے حق میں مفید ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے حیات کو اپنی مخفی قوتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔

جب حیات یا خودی مشکلات پر غالب آجاتی ہے تو مرتبۂ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو جاتی ہے۔ خودی ایک حد تک مجبور ہے اور ایک حد تک مختار۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے "اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْجَبْرِ وَالْاِخْتِیَارِ" حیات جب تقرب الٰہی حاصل کر لیتی ہے تو اختیار کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیات یا خودی، مرتبہ جبر سے مرتبہ اختیار تک پہنچنے کا نام ہے۔

جب حیات انسانیت کا جامہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نام الیغو یا شخص یا خودی ہو جاتا ہے اور شخصیت جدوجہد کی مسلسل حالت سے عبارت ہے شخصیّت کا قیام اسی حالت کے تسلسل پر منحصر ہے اگر یہ حالت قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطّل یا ضعف کی حالت طاری ہو جائے گی اور یہ بات خودی کے حق میں سمّ قاتل ہے --- شخصیّت (PERSONALITY) چونکہ انسان کا سب سے بڑا کمال ہے اس لیے اس کا فرض اوّلین یہ ہے کہ وہ اس جوہر بے بہا کو مسلسل سرگرم عمل رکھے اور وہ عمل ایسا ہو کہ خودی کی ترقی کا باعث ہو۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "عمل صالح" کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔

مسلسل جدوجہد ہی زندگی ہے (ع دوامِ ما زسوزِ ناتمام است) جو شے شخصیّت کو پیہم جدوجہد کی طرف راغب کرتی ہے وہ دراصل ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے اس لیے حسن یا اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو ضعیف یا معطل کرے وہ بُری ہے۔ گویا ہماری شخصیّت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔

PERSONALITY AS THE CRITERION OF VALUE

مَیں نے افلاطون کے فلسفہ پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب افلسفیانہ مذاہب

کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے۔ اُس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبۂ اختیار پر فائز کرنے کے لیے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے اُسی طرح اسے غیر فانی بنانے کے لیے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبۂ بقا وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لیے جدوجہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار و اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالتِ کاوش پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوّف اس حالت کے لیے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالتِ کاوش برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک وقفہ سکون ہو جسے قرآن شریف عالم برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدمہ صرف وہ افراد برداشت کر سکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو پختہ کر لیا ہوگا۔

اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ ولڈن کار نے لکھا ہے حشرِ اجساد بھی عین قرینِ عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے ہم اُسے مکان سے وابستہ کر سکتے ہیں اور اسی لیے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقیّد بالمکان زمانہ، اس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لیے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ دراصل ہم غیر زمانی ہیں۔ اور موجودہ مقیّد بالزمان زندگی میں بھی کبھی کبھی

میں اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل آنی ہوگا۔

خودی میں عشق سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شان انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات تمہیں ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ کے ترکہ سے دولت مند بنتا ہے وہ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدار فکر بناتا ہے وہ بھی سائل ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لیے آنحضرتؐ کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" آپؐ نے اپنے طرز عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

ہر کہ عشق مصطفےٰ سامان اوست　　بحر و بر در گوشۂ سامان اوست

تربیت خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستور الٰہی کی اطاعت (۲) ضبط نفس (۳) نیابت الٰہی۔

نیابت الٰہی، دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں آ کر حیات اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور

علم جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لیے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں برمحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانۂ آئندہ میں افرادِ کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے ان کا صدر اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افراد یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔

(۲)

'اسرارِ خودی'
کے مباحث عالیہ کا مختصر خاکہ

مرتبہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

علامہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لیے اسرار خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱) شاعری علامہ کے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعۂ اظہار خیالات ہے۔ لکھتے ہیں:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بت پرستی بت گری مقصود نیست[۱۲]

پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصوّر کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عروضی قواعد پر پرکھتے ہیں حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں "پیغام گو" ہے۔

(۲) خودی اصلِ نظامِ عالم ہے اور تسلسل حیات استحکام خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" موجود ہے۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است پس بقدرِ استواری زندگی است[۱۳]

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند[۱۴]

(۳) خودی کی حیات و بقا، تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است[۱۵]

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات[۱۶]

زندہ را نفیٔ تمنا مردہ کرد شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد[۱۷]

علم از سامانِ حفظِ زندگی است علم از اسبابِ تقویمِ خودی است[۱۸]

(۴) خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

از محبت می شود پاینده تر زنده تر سوز زنده تر تابنده تر[۱۹]

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست[۲۰]

خاک نجد از فیض او چالاک شد آمد اندر وجد و بر افلاک شد[۲۱]

(۵) عشق کا طریقہ محمد عربیؐ سے سیکھنا چاہیے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است[۲۲]

آنکہ بر اعداء درِ رحمت کشاد مکّہ را پیغامِ لَا تَثْرِیْبَ داد[۲۳]

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت[۲۴]

چوں گلِ صد برگ ما را بو یکیست اوست جانِ ایں نظام و او یکیست[۲۵]

(۶) بغیر آپؐ کی اتباع کے خودی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار تا کمندِ تو کند یزداں شکار[۲۶]

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا شرحِ اِنّی جاعِلٌ سازد ترا[۲۷]

(۷) خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہو جاتی ہے اور ترقی نہیں کر سکتی۔

خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ الحذر از منّتِ غیر الحذر[۲۸]

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو موجِ آب از چشمۂ خاور مجو[۲۹]

تا نباشی پیشِ پیغمبرؐ خجل روز فردائے کہ باشد جاں گسل[۳۰]

ہمّت از حق خواہ و با گردوں ستیز آبروئے ملّتِ بیضا مریز[۳۱]

(۸) جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظام عالم کو مسخر کر لیتی ہے۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشتِ او شق می شود[۳۲]

در خصوماتِ جہاں گردد حکم تابعِ فرمانِ او دارا و جم[۳۳]

(۹) مسئلہ نفیٔ خودی اقوام مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوام غالبہ کے قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں اس لیے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ یہ مسئلہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔

صد مرض پیدا شد از بے ہمّتی کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی[۳۴]

(۱۰) افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترکِ عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لیے مُضر ہے۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود جانِ او وارفتۂ معدوم بود[۳۵]

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیانِ نامشہود گشت[۳۶]

قومہا از سُکرِ او مسموم گشت خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت[۳۷]

(۱۱) ادبیاتِ اسلامیہ بھی مثل دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں۔ شعراء اور ادباء کو چاہیے کہ ایسے مضامین پر قلم کریں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں حرکت پیدا ہو۔

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن بر عیارِ زندگی او را بزن[۳۸]
فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است چوں درخشِ برق پیش از تندر است[۳۹]
فکرِ صالح در ادب می بایدت رجعتے سوئے عرب می بایدت[۴۰]

(۱۲) تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہیہ۔

(ا) اطاعت

در اطاعت کوش اے غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار[۴۱]
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل زایں ساماں روی[۴۲]
شکوہ سنج سختیٔ آئیں مشو از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو[۴۳]

(ب) ضبطِ نفس

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں می شود فرماں پذیر از دیگراں[۴۴]
تا عصائے لا الٰہ داری بدست ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست[۴۵]
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد فارغ از بندِ زن و اولاد شد[۴۶]
می کند از ما سوٰی قطعِ نظر می نہد سا طور بر حلقِ پسر[۴۷]

(ج) نیابتِ الٰہی

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است ہستیٔ او ظلِّ اسمِ اعظم است[۴۸]
از رموزِ جزو و کل آگہ بود در جہاں قائم بامر اللہ بود[۴۹]
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر[۵۰]
مدعائے علّم الاسمائے سرّ سبحان الذی اسرائے[۵۱]
ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است از جلالِ او نجاتِ عالم است[۵۲]

(۱۳) حیاتِ ملّی کا تسلسل روایاتِ ملّیہ کی حفاظت و مداومت پر موقوف ہے۔ جو قوم اپنی ملّی روایات سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اپنی ثقافتی روایات پر قائم رہنا چاہیے۔

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن[۵۳]

(۱۴) مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصود اگر تسخیرِ ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است مسلم ار عاشق نباشد کافر است[۵۴]
تابعِ حق دیدنش نادیدنش خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش[۵۵]
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار تا ز تو گردد جلالش آشکار[۵۶]
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید تیغِ او بر سینۂ او آرمید[۵۷]
زندگی از طوفِ دیگر رستن است خویش را بیت الحرم دانستن است[۵۸]

(۱۵) موجودہ عقل و خرد اور تہذیب در اصل جہالت اور سفاہت ہے۔ مسلمانوں کو اس مادّی تمدّن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لیے کمزور ہے۔

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است معنیٔ اسلام ترکِ آفل است[۵۹]
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے[۶۰]
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است بت پرست و بت فروش و بتگر است[۶۱]

(۱۶) وقت (TIME) پر وہی شخص حکمران ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ چنانچہ مرشد رومی کہتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را اوست سیّد جملہ موجودات را[۶۲]

امام شافعیؒ نے وقت کو سیف قاطع قرار دیا ہے۔ وقت در اصل حیات ہے اور کوئی

شخص حیات کو وقت سے جدا کر کے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم سرِّ ایں شمشیر چیست　　آب او سرمایہ دار از زندگیست[۶۳]
پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود　　قوتِ او از ہمیں شمشیر بود[۶۴]
تو کہ از اصلِ زماں آگہ نۂ　　از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ[۶۵]
زندگی از دہر و دہر از زندگی است　　'لا تسبّو الدّہر' فرمانِ نبیؐ است[۶۶]
نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت　　غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت[۶۷]

(۱۷) آخر میں علامہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ:۔

(ا) عشق را از شغلِ لا آگاہ کن　　آشنائے رمز اِلاّ اللہ کن[۶۸]

(ب) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے یعنی محل تو ہے مگر لیلیٰ نہیں۔ میں مثل شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں۔ پس اے خدایا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے ایک ہم دم عطا کر۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے　　از رموزِ فطرتِ من محرمے[۶۹]
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش　　باز بینم در دلِ او روئے خویش[۷۰]

****

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآراء تصنیف

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام

عمدہ سفید کاغذ، دیدہ زیب طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد
قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

ملّتِ اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاصۂ رموزِ بے خودی

مرتبہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

جس طرح خودی کے معنی تکبّر یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۱) ربطِ فرد و ملّت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوا جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں "شیطان جماعت سے دُور رہتا ہے"۔

فرد می گیرد ز ملّت احترام　　ملّت از افراد می یابد نظام[۷۱]

فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جملہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد　　شعلہ ہائے نغمہ در عُودش فسرد[۷۲]

انسان کے اندر "جوہرِ نوری" ہے۔ قوّتِ ادراک اُسی کی ایک شعاع ہے۔ اس کی ترقی جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است　　جزوِ اورا قوّتِ کُل گیری است[۷۳]
در جماعت خود شکن گردد خودی　　تا ز گلبرگے چمن گردد خودی[۷۴]

(۲) ملّت اختلاطِ افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوّت سے ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف الخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کر کے قوم بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم بنا دیا اور عربوں کو سرکارِ مدینہؐ نے

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است ہستیٔ کوکب ز کوکب محکم است[۷۵]

نبیؐ افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ زیں بتانِ بے زبان کمتر نۂ[۷۶]

اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تا سوئے یک مدعایش می کشد حلقۂ آئیں بپایش می کشد[۷۷]

نکتۂ توحید باز آموز دش رسم و آئینِ نیاز آموزدش[۷۸]

(۳) ارکانِ اساسی (BASIC PRINCIPLES OF ISLAM)

(ا) اسلام کا رکنِ اوّل توحید ہے۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔

عقلِ انسانی اسی توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحل کہاں مل سکتا ہے۔ مومن میں دین، حکمت، آئین، زور، قوت اور تمکین سب توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلم حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیرِ کائنات[۷۹]

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[۸۰]

ملّتِ اسلامیہ کے لیے توحید بمنزلۂ روحِ رواں ہے۔ اگر توحید کا تصوّر خارج کر دیا جائے تو ملّتِ اسلامیہ لاشۂ بے جان رہ جائے گی۔

ملّتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ[۸۱]

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[۸۲]

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لیے ملّتِ اسلامیہ کا مقصود بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔

ملّت از یک رنگیٔ دلہاستے روشن از یک جلوہ ایں سیناستے[۸۳]

قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدّعا باید یکے[۸۴]

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

بر نسب نازاں شدن نادانی است حکمِ او اندر تن و تن فانی است[۸۵]

ملّتِ ما را اساسِ دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است[۸۶]

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم یک زباں و یک دل و یک جاں شدیم[۸۷]

(۳) ب: یاس و حزن و خوف اُمّ الخبائث ہیں اور حیات کے دشمن ہیں۔ توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی نا اُمید نہ ہو کیونکہ نا اُمیدی حیات کے لیے سامانِ مرگ ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تعلیمِ لَا تَحْزَنْ بگیر[۸۸]

قوّتِ ایماں حیات افزایدت وردِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ بایدت[۸۹]

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است کاروانِ زندگی را رہزن است[۹۰]

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست اصلِ او بیم است اگر بینی درست[۹۱]

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است[۹۲]

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس[۹۳]

(۴) رکنِ دوم رسالت: جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان بر رسالت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے سے تنِ مردہ میں جان آجاتی ہے اور دین و آئین کی بنیاد رسالت ہی ہے۔ رسولؐ مسلم کے قلب و جگر کی قوّت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے۔

سرکارِ مدینہ نے ہمیں دینِ حق اور مذہبِ فطرت عطا کیا اور اس لیے کہ ہماری وحدت میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہو جائے۔ خدا نے ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کر دی۔

قوّتِ قلب و جگر گردد نبیؐ از خدا محبوب تر گردد نبیؐ[۹۴]

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم در رہِ حق مشعلے افروختیم[۹۵]

لَانَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسان خداست پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است[۹۶]

(۴) ب: رسالتِ محمدیؐ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت و اخوت و مساوات قائم ہو جائے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو حریت و اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔

کُلُّ مُؤمِنْ اِخْوَۃٌ اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گلش[۹۷]

ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ[۹۸]

اس کے بعد علامہ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں۔ حریت کی مثال میں امام حسینؓ کی شہادت پیش کی ہے۔

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است[۹۹]

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست[۱۰۰]

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم[۱۰۱]

رمزِ قرآن سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

(۵) چونکہ ملتِ محمدیؐ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ حقائق محدود فی المکان نہیں ہیں اس لیے ملتِ محمدیؐ بھی محدود فی المکان نہیں۔ اس لیے:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مسلم استی دل باقلیمے مبند گم مشو اندر جہانِ چون و چند[۱۰۲]

دل بدست آور کہ در پہنائے دل می شود گم ایں سرائے آب و گل[۱۰۳]

آنحضرتؐ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ مدینہ کو وطن بنا لیا جو آپؐ کا جائے ولادت نہیں تھا۔ یعنی تمام دنیا مسلمان کا وطن ہے اور تمام زمین

اس کے لیے مسجد ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است[۱۰۴]

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو[۱۰۵]

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد چوں فلک در شش جہت آباد شد[۱۰۶]

(۶) وطن اساسِ ملت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کے لیے ازبس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوت کا زریں اصول تباہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ملت کی تعمیر وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوعِ انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہنگامہ بپا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساسِ ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت[۱۰۷]

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شد و اقوام ماند[۱۰۸]

(۷) جس طرح ملتِ محمدیؐ محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقید بالزمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ملتِ محمدی اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

امتِ مسلم ز آیاتِ خداست اصلش از ہنگامہ قَالُوْا بَلٰی ست[۱۰۹]

از اجل ایں قوم بے پرواستے استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا ستے[۱۱۰]

تا خدا اَنْ یُّطْفِؤُا فرمودہ است از فسردن ایں چراغ آسودہ است[۱۱۱]

(۸) نظامِ ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور اس لیے خدا نے نظامِ ملت کے قیام و ثبات کے لیے قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنا ملی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستورِ حیات اور ضابطۂ عمل بنانا چاہیے۔

ہستی مسلم ز آئین است و بس باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس[۱۱۲]

آں کتابِ زندۂ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم[113]
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے[114]
نوعِ انساں را پیامِ آخریں عاملِ او رحمۃٌ لّلعالمیں[115]

اس کے بعد علامہ نے مسلمِ سُست پیما سے خطاب کیا ہے اور دو لفظوں میں رازِ حیات بیان کر دیا ہے۔

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو شیوہ ہائے کافری زندانِ تو[116]
قطع کردی امرِ خود را در زُبُر جادۂ پیمائی اِلیٰ شَیْءٍ نُکُر[117]
گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن[118]

(۹) انحطاط کے زمانہ میں تقلید کرنا اجتہاد کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ یہاں تقلید کے معنی فقہی نہیں ہیں بلکہ روایاتِ ملّی پر عامل ہونے کے ہیں۔ علامہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اگر تقلید بودے شیوۂ نیک پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے[119]

یعنی تقلید کو بُرا بتایا ہے۔ اس جگہ تقلید کو اجتہاد سے اولیٰ تر قرار دیا ہے پس معلوم ہوا کہ وہاں تقلید کے معنی کورانہ پیروی کے ہیں اور یہاں تقلید کے معنی اپنی ثقافتی روایاتِ ملّی (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور ان پر عمل کرنا ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیّت است معنیٔ تقلید ضبطِ ملّت است[120]

اس شعر میں خود بھی تقلید کے معنی صاف کر دیتے ہیں۔

نقش بر دل معنیٔ توحید کن چارۂ کارِ خود از تقلید کن[121]
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط[122]
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر[123]
از یک آئینی مسلماں زندہ است پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است[124]
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست[125]

الغرض تقلید کے معنی ہیں قرآنی احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرنا اور یک آئینی کو اپنا نصب العین بنانا۔ سنّتِ نبویؐ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔

(۱۰) اتباعِ آئینِ الٰہیہ سے سیرتِ ملّی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تراشا ہے۔ اس میں سراسر نور اور روشنی ہے۔ اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علمِ حقیقت شریعت سے جُدا نہیں ہے اور سنّت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ سے محبّت کی جائے۔ 'ہر کہ عشقِ مصطفےٰ الخ' اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباعِ شریعت کریں۔ ملّت کا نظام اتباعِ شریعت پر مبنی ہے۔ جب یہ نظام محکم ہو جاتا ہے تو ملّت کو دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" SECRET پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوّت اتباعِ شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔

سرِّ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست؟ زیستن اندر خطرہا زندگیست[126]

آنحضرت صلعم کا دین زندگی بخشنے والا دین ہے۔

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات شرعِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات[127]

جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبویؐ سے رُوگردانی کی رمزِ لقا سے محروم ہو گئے۔

تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت قوم را رمزِ لقا از دست رفت[128]

آخر میں نصیحت کی ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدودِ اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیے۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر از خیالاتِ عجم باید حذر[129]
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گزشت[130]
قلب را زیں حرفِ حق گرداں قوی با عرب در ساز تا مسلم شوی[131]

(۱۱) سیرتِ قومی میں اتباعِ رسولؐ سے حسن وخوبی پیدا ہوسکتی ہے۔ چنانچہ مرشد رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

مگسل از ختم الرسلؐ ایّامِ خویش تکیہ کم کن برفن و برگامِ خویش[۱۳۲]

مسلمانوں کے لیے حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات ستودہ صفات بہترین نمونہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رہنما بنانا کارِ نادانی ہے۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ[۱۳۳]

از بہارش رنگ و بو باید گرفت بہرۂ از خُلق او باید گرفت[۱۳۴]

آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم[۱۳۵]

از مقامِ او اگر دور ایستی از میانِ معشرِ ما نیستی[۱۳۶]

(۱۲) حیاتِ ملّیہ کے لیے ایک مرکزِ محسوس بھی اشد ضروری ہے اور مسلمانوں کا مرکز بیت الحرام ہے۔ سب مسلمانوں کو اس سرزمین کو اپنا مرکز یقین کرنا چاہیے۔ مکّہ واقعی ہمارا کعبۂ مقصود ہے اور جسے مکّہ سے محبت نہیں اس کے ایمان میں خلل ہے جو جماعت مکّہ کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین کو اپنا مرکز قرار دے وہ اسلام سے خارج ہے۔

ہم چناں آئینِ میلادِ اُمم زندگی بر مرکزے آید بہم[۱۳۷]

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے[۱۳۸]

راز دارد رازِ ما بیت الحرام سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام[۱۳۹]

در جہاں مارا بلند آوازہ کرد با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد[۱۴۰]

(۱۳) تنظیمِ حقیقی کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ افرادِ ملّت کے سامنے کوئی نصب العین ہو اور ہر فرد اس کے حصول میں منہمک ہو اور امّتِ محمدیؐ کا نصب العین یہ ہے کہ توحید کی حفاظت اور اشاعت کی جائے گویا ہر مسلمان مبلّغ اسلام ہے۔

مدّعا رازِ بقائے زندگی جمعِ سیماب قوائے زندگی[۱۴۱]

چوں حیات از مقصدے محرم شود ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود[۱۴۲]

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل[۱۴۳]

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست[۱۴۴]

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے گر مسلمانی نیا سائی دمے[۱۴۵]

آجکل جبکہ الحاد اور مادیت کا زور ہے قرآنی تعلیمات کی اشاعت ازبس ضروری ہے۔ موجودہ مشکلات کا حل اس کتاب میں موجود ہے۔ پس مسلمانوں کو یکسر تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں منہمک ہو جانا چاہیے۔

(۱۴) حیاتِ ملّی میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔ عہدِ ماضی میں مسلمانوں کا یہی شعار تھا لیکن اب علوم وفنون سے بے بہرہ ہیں تحقیق و اجتہاد کو کفر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی درکنار تنزّل کر رہے ہیں۔

ما سوا از بہرِ تسخیر است و بس سینۂ او عرضۂ تیر است و بس[۱۴۶]

غنچۂ؟ از خود چمن تعبیر کن شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن[۱۴۷]

خیز و واکن دیدۂ مخمور را دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را[۱۴۸]

غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است امتحانِ ممکناتِ مسلم است[۱۴۹]

حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد[۱۵۰]

تو کہ مقصودِ خطابِ اُنظُری پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری[۱۵۱]

علمِ اسما اعتبارِ آدم است حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است[۱۵۲]

(۱۵) حیاتِ ملّیہ کا کمال یہ ہے کہ ملّت میں بھی فرد کی طرح اپنی خودی کا احساس پیدا ہو جائے اور اس احساس کی تولید اور تکمیل اپنی ملّی روایات (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور اشاعت سے ممکن ہے۔

ملّت میں خودی کے احساس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد اپنی جگہ بہبودِ ملّت کا ذمہ دار ہو۔

اگر زید کو تکلیف پہنچے تو تمام جماعت اس تکلیف کو محسوس کرے۔ اس کا نظارہ دہلی نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا جبکہ بارہ سپاہیوں اور اُن کے افسر نے بخوشی میگزین میں آگ لگا دی اور خود بھی اس میں جل کر مر گئے تاکہ وہ بارود اُن کے دشمن اُن کے بھائیوں کے خلاف استعمال نہ کر سکیں۔ وہ بظاہر مر گئے لیکن بباطن زندہ ہیں اور لارڈ ولنگڈن سر ہربرٹ ایمرسن اور دوسرے گورنران صوبجات کی شکل میں آج ۱۹۳۳ء میں ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو ان کا ابھرنا اور ترقی کرنا معلوم۔ فی الحال تو یہ کیفیت ہے کہ ہندو سے زیادہ مسلمان مسلمان کا دشمن ہے۔ میونسپل کمیٹی اور کونسل سب جگہ منافرت اور منافقت کا بازار گرم ہے۔ (واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۳۳ء کی ہے: مدیر)

اس احساس کو پیدا کرنے کے لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنا اور اپنی روایاتِ ملّی کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ زندہ اقوام اپنی روایات کی بہت حفاظت کرتی ہیں اور بچّوں کے قلوب میں ان روایات کا نقش قائم کرتی ہیں لیکن ہندوستان میں ہماری تعلیم انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انہیں کلرکوں کی ضرورت ہے نہ کہ قومی درد رکھنے والوں کی۔

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ ہے ڈبے کا اور تعلیم ہے سرکار کی

ربطِ ایّام است مارا پیرہن سوزنش حفظِ روایاتِ کہن[۱۵۳]
چیست تاریخ اے ز خود بیگانۂ داستانے قصّۂ افسانۂ[۱۵۴]
ایں ترا از خویشتن آگہ کند آشنائے کار و مردِ رہ کند[۱۵۵]
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال رشتۂ ماضی ز استقبال و حال[۱۵۶]

(۱۶) بقائے نوع امومت (MOTHERHOOD) پر منحصر ہے اس لیے اسلام میں امومت کے احترام کو فرضِ عین قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے "عورت" کو بڑا بلند درجہ عنایت کیا ہے کیونکہ عورت مرد کے لیے باعثِ

تسکین اور کائنات کے لیے موجبِ رونق ہے۔ مرد میں عورت ہی کی وجہ سے نغمہ پیدا ہوتا ہے بلکہ مرد کے لیے موجبِ زینت و آسائش ہے اسی لیے آنحضرت صلعم نے خوشبو اور نماز کے ساتھ اس کا ذکر بھی فرمایا۔

جو مسلمان عورت کو اپنا خادم یا ماتحت خیال کرتا ہے وہ فہمِ قرآن سے محروم ہے لکھتے ہیں:

آنکہ نازد بر وجودش کائنات ذکرِ او فرمود با طیب و صلوٰۃ[۱۵۷]
مسلمے کو را پرستارے شمرد بہرۂ از حکمتِ قرآں نبرد[۱۵۸]
نیک اگر بینی امومت رحمت است زانکہ او را با نبوّت نسبت است[۱۵۹]
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است سیرتِ اقوام را صورت گر است[۱۶۰]
گفت آں مقصودِ حرفِ کُن فکاں زیرِ پائے امّہات آمد جناں[۱۶۱]
ملّت از تکریمِ ارحام است و بس ورنہ کارِ زندگی خام است و بس[۱۶۲]
حافظِ رمزِ اخوّت مادراں قوّتِ قرآن و ملّت مادراں[۱۶۳]

(۱۷) عورتوں کے لیے سیّدۃ النّسا۔ فاطمۃ الزہراؓ اُسوۂ حسنہ ہیں۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ[۱۶۴]
آں ادب پروردۂ صبر و رضا آسیا گرداں و لب قرآں سرا[۱۶۵]

(۱۸) خطاب بہ مخدراتِ اسلام۔ علاّمہ مسلمان عورتوں سے خطاب فرماتے ہیں کہ مادران اسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو سب سے پہلے اسلام اور اسلامی روایات سے آگاہ کریں اور اپنے فرض کو پہچانیں۔ وہ ذمہ دار ہیں اور بچّوں کی سیرت انہی کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔

موجودہ زمانہ بڑا پُرآشوب ہے کفر و الحاد کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ مسلمان بچّوں کو قرآنی تعلیمات سے مسلّح کر کے کارزارِ عالم میں بھیجیں۔

کودکِ ما چوں لب از شیرِ تو شست لا الٰہ آموختی او را نخست[۱۶۶]

می ترا شد مہرِ تو اطوارِ ما فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما [۱۶۷]

دورِ حاضر تر فروش و پُرفن است کاروانش نقدِ دیں را رہزن است [۱۶۸]

کور و یزداں ناشناس ادراکِ اُو ناکساں زنجیریٔ پیچاکِ اُو [۱۶۹]

ہوشیار از دستبردِ روزگار گیر فرزندانِ خود را در کنار [۱۷۰]

(۱۹) آخر میں علامہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہے۔ میں اس کا خلاصہ بھی طوطیائے چشم بناتا ہوں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت صدیق اکبرؓ کو خواب میں دیکھا تو اُن سے کہا کہ اُمتِ مرحومہ کی بہبود کی کوئی صورت بتایئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کو سورۂ اخلاص سے آب و تاب حاصل کرنی چاہیے۔

توحید کا رنگ پیدا کر لو سارے عقدے حل ہو جائیں گے۔

با یکی ساز از دوئی بردار رخت وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت [۱۷۱]

خدا نے مسلمانوں کو ایک قوم بنایا وہ اب ترک، افغان اور ہندی بنے ہوئے ہیں۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کے معنی زبان سے ادا کرنے سے کام نہیں بنتا، جب تک مسلمان وحدت کا رنگ اپنے اندر نہ پیدا کریں۔ جس طرح اُن کا خدا ایک ہے اسی طرح انہیں بھی ایک ہونا چاہیے۔

یک شود توحید را مشہود کن غائبش را از عمل موجود کن [۱۷۲]

لذتِ ایماں فزاید در عمل مُردہ آں ایماں کہ ناید در عمل [۱۷۳]

(ب) اَللّٰہُ الصَّمَدُ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے تم بھی غیر اللہ سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کو کعبۂ مقصود بنا لو۔

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست زندگانی گردشِ دو لاب نیست [۱۷۴]

مسلم استی بے نیاز از غیر شو اہلِ عالم را سراپا خیر شو [۱۷۵]

راہ دشوار است ساماں کم بگیر در جہاں آزاد زی آزاد میر [۱۷۶]

پشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را سر بدہ از کف مدہ ناموس را [۱۷۷]

بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است [۱۷۸]

آفتاب استی یکے در خود نگر از نجومِ دیگراں تابے مخور [۱۷۹]

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے [۱۸۰]

(ج) جس طرح اللہ تعالیٰ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہے اُسی طرح مسلم رنگ و خون سے بالاتر ہے۔ اسلام میں حسب و نسب، رنگ، قوم، ذات پات، نسل، زبان، دولت ثروت یہ سب ہیچ ہیں۔

فارغ از اُمّ و اب و اعمام باش ہمچو سلمانؓ زادۂ اسلام باش [۱۸۱]

گر نسب را جزوِ ملّت کردۂ رخنہ در کارِ اخوّت کردۂ [۱۸۲]

دل بہ محبوبِ حجازیؐ بستہ ایم زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم [۱۸۳]

رشتۂ ما یک تولّا لیش بس است چشمِ ما را کیفِ صہبا لیش بس است [۱۸۴]

عشق در جان و نسب در پیچ است رشتۂ عشق از نسب محکم تر است [۱۸۵]

ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است بے خبر از لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ است [۱۸۶]

(د) وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی اللہ کا ہمسر نہیں، کوئی قوم مسلمانوں کی بھی ہمسر نہیں۔

رشتۂ با لَمْ یَکُنْ باید قوی تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی [۱۸۷]

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک بندہ اش ہم در نسازد با شریک [۱۸۸]

خرقۂ لَا تَحْزَنُوْا اندر برش اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تاجے بر سرش [۱۸۹]

پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر امر و نہی او عیارِ خیر و شر [۱۹۰]

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی [۱۹۱]

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ [۱۹۲]

(۲۰) عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ

اس آخری باب میں علامہ نے سرکارِ مدینہؐ سے عرض کی ہے کہ حضورؐ! مسلمان ہبّرِ نبیؐ سے بیگانہ ہوگیا ہے اُس نے عرب سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا ہے اور عجمی خیالات عجمی تمدن اور عجمی وضع اختیار کرلی ہے۔ میں نے اُسے قرآن کی طرف بلایا ہے۔

محفل از شمعِ نوا افروختم قوم را رمزِ حیات آموختم [۱۹۳]

لیکن اگر میں نے قرآن کے علاوہ کسی اور شے کی طرف بلایا ہے تو بے شک آپ مجھے جو مرضی ہو سزا دیں۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است [۱۹۴]

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن [۱۹۵]

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا [۱۹۶]

اور اگر میں نے قرآن ہی کی طرف بلایا ہے تو پھر اتنی درخواست ہے۔

عرض کن پیشِ خدائے عزّوجل عشق من گردد ہم آغوشِ عمل [۱۹۷]

سب سے آخر میں علامہ نے سرکارِ مدینہؐ کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ اپنی ایک دلی آرزو پیش کی ہے:

زندگی را از عمل ساماں نبود پس مرا ایں آرزو شایاں نبود [۱۹۸]

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز آرزو دارم کہ میرم در حجاز [۱۹۹]

از درت خیزد اگر اجزائے من وائے امروزم خوشا فردائے من [۲۰۰]

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش مرقدے در سایۂ دیوار بخش [۲۰۱]

علامہ کی یہ دعا اس قدر رقّت آمیز ہے کہ کوئی صاحب دل بغیر چشم تر کیے اُسے ختم نہیں کرسکتا۔

خدا کرے علامہ کی یہ دعا قبول ہو اور علامہ کے علاوہ دیگر عاشقانِ رسولؐ کو بھی یہ سعادت نصیب ہو۔ آمین

(میثاق، جولائی و اگست ۱۹۶۹ء)

سید نذیر نیازی مرحوم

اقبال اور قرآن

(ماخوذ از میثاق، جنوری فروری ۱۹۵۴ء)

انجمن خدام القرآن کے مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں پر قرآن مجید کے کچھ حقوق ہیں۔ ایک اسے ماننا، دوسرا پڑھنا، تیسرا سمجھنا، چوتھا عمل کرنا، پانچواں دوسروں تک پہنچانا۔ پھر ان پانچوں حقوق کو بعنوانات ذیل یوں ترتیب دیا ہے تاکہ ہم سمجھ لیں کہ یہ حقوق فی الواقع ہیں کیا اور باعتبار ان کے ہم پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

۱ : ایمان اور تعظیم
۲ : تلاوت اور ترتیل
۳ : تذکّر اور تدبّر
۴ : حکم اور اقامت
۵ : تبلیغ اور تبیین

ایمان اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو صدقِ دل سے مانیں۔ ہر حالت میں اس کے ادب اور احترام کا خیال رکھیں۔ نہ کوئی ہستی اللہ تعالیٰ سے زیادہ واجب التعظیم ہے نہ اُس کے کلام سے بڑھ کر کوئی اور کلام واجب تعظیم و تکریم۔

تلاوت و ترتیل سے مراد ہے قرآن مجید کو جملہ آدابِ ظاہری و باطنی اور لوازم تجوید کے ساتھ خوش دلی اور خوش الحانی سے رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا تاکہ اس کی تعلیمات ذہن نشین ہوتی جائیں۔ ہم خلوصِ نیت سے ان کے اتباع اور پیروی پر آمادہ رہیں۔

تذکّر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ہر ارشاد بطور ایک حقیقت ذہن میں مستحضر رہے۔ ہم اسے کبھی نہ بھولیں۔ ہر حالت میں اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہیں۔ تدبّر کے معنی ہیں غور و فکر

اور اس سے مقصود یہ کہ ہم ان حقائق کا فہم اور ادراک پیدا کریں جن کی طرف قرآن مجید نے بکمالِ فصاحت و بلاغت جابجا اشارہ کیا۔ بالفاظِ دیگر آیات الٰہیہ کا مطالعہ و مشاہدہ جو انفس و آفاق میں بکھری پڑی ہیں۔ جن کا تعلق جہاں انسان اور کائنات سے ہے وہاں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بھی ہے تاکہ ہم سمجھیں کہ قرآن مجید کی دعوت کیا ہے۔ ہماری غایتِ حیات کیا عالم انسانی ہو یا عالم فطرت مشیّتِ الٰہیہ اس میں کس طرح کارفرما ہے۔ ہم اپنی کنہ ذات تک پہنچیں۔ یہ جان لیں اسے کائنات اور خالق کائنات سے کیا تعلق ہے۔ اس طریق زندگی میں جو ہمارے لیے تجویز ہوا کیا مصلحت ہے یہ بنیادی سوالات ہیں جن پر انسان ہمیشہ سے غور کرتا چلا آیا اور غور کرتا رہے گا۔ لہٰذا قرآن مجید میں تدبّر اور تفکر بھی ایک ایسا عمل ہے جس کی کوئی انتہا ہے نہ اختتام۔

حکم اور اقامت ہے قرآن مجید کے احکام کی منصفانہ پابندی اور ان سب فرائض کی جو اس طرح عائد ہوتے ہیں ہر حالت میں بجا آوری۔ اقامت وہ جدوجہد ہے جو اس نظام اجتماع یا معاشرت کے قیام و استحکام میں لازم ٹھہرتی ہے جو قرآن مجید کا مقصود ہے اور جس کی ابتدا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اصولاً اور عملاً ہر پہلو اور ہر جہت سے واضح اور مکمل طور پر کر دی۔

تبلیغ عبارت ہے تعلیماتِ قرآنی کی ہمہ گیر اشاعت سے کہ ان سے دنیا کا کوئی انسان اور کوئی قوم بے خبر نہ رہے اور تبیین یعنی جیسا بھی موقعہ اور جیسے بھی حالات کا تقاضا ہے آیاتِ قرآنی کی توضیح و تشریح۔

آیئے اب ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کے پیشِ نظر یہ دیکھیں کہ اقبال نے ان حقوق کو کس طرح اور کہاں تک پورا کیا۔

سب سے پہلا فریضہ ایمان اور تعظیم ہے اور اسی سے ایک مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے قرآن مجید کو ویسے ہی مانا جیسے ہر سچّے مسلمان کا فرض ہے وہ صدق دل سے اس پر ایمان لائے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے لفظاً اور معناً حضور رسالت مآبؐ پر نازل ہوا اور بعینہٖ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی تعلیمات عالمگیر ہیں۔ دوامی اور ابدی، جن میں سرمو کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ تعظیم کا یہ عالم تھا کہ جہاں قرآن مجید کا ذکر آیا ان کا سر فرطِ ادب سے جھک گیا۔ چہرہ متغیّر ہو گیا۔ بفحوائے "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ"۔ قرآن مجید کی عظمت کا احساس بڑھتا جاتا۔ کسی گہری فکر میں ڈوب جاتے اس عالم میں ان کی دلی کیفیت کا اندازہ انہیں کے اس شعر سے کیجئے جس میں گویا اسی ارشاد باری تعالیٰ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ ..... کی ترجمانی نہایت خوبی سے ہو گئی ہے

آنکہ دوشش کوہ بارش برنتافت سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

تلاوت کا فریضہ تو اس وقت تک جاری رہا جب تک علالت نے انہیں بے بس نہیں کر دیا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور قرآن مجید ہی پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بچپن ہی سے نماز فجر کے بعد علی الصبح قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ باادب بیٹھ جاتے۔ خوش الحان تھے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر غور کرتے۔ ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتے تاکہ ہر لفظ اور ہر آیت کے معنی ذہن نشین ہو جائیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ ہی ان کا محبوب ترین اور دل و دماغ کا سرمایہ تھا۔ ان کی غذا نے رُوح ان کے لیے سرور و ابتہاج کا لازوال سرچشمہ۔ علالت کے ہاتھوں دم کشی اور حبس صوت کے باعث جب تلاوت سے معذور ہو گئے تو افسوس فرمایا ع

لطف قرآنِ سحر باقی نماند

قرآن مجید سے ان کی شیفتگی اور والہانہ شغف کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی مصروفیت ہو، کیسا بھی انہماک گھر بار کے معاملات، دنیا کے دھندے ان کا دل ہمیشہ قرآن مجید میں رہتا۔ دورانِ مطالعہ ہی اکثر رقّت طاری ہو جاتی۔ باآواز بلند تلاوت کر رہے ہیں تو آواز گلوگیر ہے آنکھیں پُرنم۔

تذکّر کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کوئی گفتگو ہو، تحریر یا تقریر جہاں کوئی بات کہنے کی ہوتی ان کا ذہن بے اختیار ارشاداتِ قرآنی کی طرف منتقل ہو گیا۔ جہاں کوئی حقیقت سامنے آئی کوئی فکر ذہن میں اُبھرا قرآن مجید کے حوالے سے اس کی وضاحت کر دی۔ مثالیں بہت ہیں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، ارضِ پاک و ہند میں ایک آزاد اسلامی قومیت کی تشکیل کا اوّلین اعلان تھا۔ اسلامی قومیت کی تشکیل اور وہ بھی صدیوں کے زوال و انحطاط، فرقہ آرائیوں اور فرقہ بندیوں کے بعد معمولی نصب العین نہیں تھا۔ اسلامی قومیت کے احیاء اور اسلامی قومیت کے قیام میں خطرے ہی خطرے تھے۔ اندرونی اور بیرونی بھی، اس کے لیے شدید جدوجہد، بڑے صبر و استقامت، ایمان کامل اور

یقینِ محکم کی ضرورت تھی۔ یہ ایک آزمائش تھی جس میں قرآن مجید ہی سے تمسک اور قرآن مجید ہی کی رہنمائی سے پورے اُتر سکتے تھے۔ لہٰذا اقبال جب سب کچھ کر چکے تو سلسلۂ کلام اس ارشاد قرآنی پر ختم کیا۔ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۔ اور ظاہر ہے اس موقعہ پر اس سے زیادہ مناسب تنبیہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اگر ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے ہم راہِ ہدایت پر گامزن ہیں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ بعینہٖ ۱۹۲۲ء میں جب عالم اسلام کا سیاسی اجتماعی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب کوئی سرزمین نہیں تھی جہاں مسلمان آزادی کا سانس لے سکے۔ جب ان حالات میں اقبال نے خضرِ راہ کے عنوان سے وہ مشہور نظم جو گویا شمع و شاعر کا تتمہ ہے پڑھی تو اس کا خاتمہ بھی اس ارشادِ باری تعالیٰ پر ہوا۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لاتخلف المیعاد دار

کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ یاس کفر ہے۔ قرآن مجید نے اہل یاس کا شمار اصحاب قبور میں کیا ہے اس دورِ ابتلا میں جب ہر طرف مایوسی ہی مایوسی چھا رہی تھی 'لاتخلف المیعاد' سے بڑھ کر امید و اعتماد کا پیغام اور کیا ہو سکتا تھا۔

رہا تدبر سو اس باب میں کیا عرض کیا جائے۔ محمد اقبال نے جو کچھ کہا جو کچھ سوچا جو کچھ لکھا، شعر ہو یا فلسفہ قرآن مجید ہی میں تدبر اور تفکر کی بدولت۔ اس تدبر اور تفکر کی مثالیں پیش کرنا اس کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ یہ تو ایک مستقل موضوع ہے۔ مختصراً یہ کہ اقبال کا سرمایۂ فکر قرآن مجید ہی کی تعلیمات تھیں اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی شاعری اور افکار کا بغور مطالعہ کیجئے اس میں قرآن مجید ہی کی روح کارفرما ہے اور قرآن مجید ہی کی ترجمانی مقصود۔ اسرار و رموز اور خطبات کے علاوہ کتنی تحریریں ہیں جن کی اساس قرآن مجید ہی میں ان کا تدبر اور تفکر ہے۔ پھر یہی تدبر اور تفکر بانگ درا سے لے کر بالِ جبریل، ضربِ کلیم، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، پس چہ باید کرد، مسافر اور ارمغانِ حجاز میں ہر کہیں نمایاں ہے۔ بلکہ ان کی متفرق تحریریں، بیانات، تقریریں اور خطوط بھی اس سے خالی نہیں۔ گفتگوؤں میں بات پھر کر قرآن مجید ہی کے معارف اور حکم پر آجاتی ..... زمانہ طالب علمی ہی میں جب انہیں قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کا سبق دیا جا رہا تھا ان کے والد محترم بھی انہیں یہی نصیحت کرتے۔ ایک روز کہنے

لگے قرآن مجید پڑھتے تو ہو اسے سمجھتے بھی ہو۔ یاد رکھو قرآن مجید پڑھنے ہی سے نہیں دل کے راستے سے بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسے پڑھو تو یوں سمجھو جیسے قرآن مجید تمہارے دل پر نازل ہو رہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اس تدبر اور تفکر اور دل کے راستے سے قرآن مجید کو سمجھنے کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میں پھر دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک روز کہنے لگے فلسفہ ہو یا سائنس، زندگی اور اس کے مسائل، کوئی عقدہ ہو حل ہوتا نظر نہ آئے تو قرآن مجید سے رجوع کرتا ہوں۔ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت شائع ہوا اور اس کے ماتحت یہ ماننا لازم ٹھہرا کہ کائنات اضافہ پذیر ہے تو میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ کئی دن سوچتا رہا بالآخر ایک روز اس پریشانی میں دفعتاً خیال آیا۔ کیوں نہ قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کروں۔ میں نے علی بخش کو پکارا، علی بخش قرآن مجید لے آؤ۔ علی بخش قرآن مجید لایا اور میں نے اسے کھولا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب پہلی آیت جس پر میری نگاہ پڑی یہ تھی 'وَاللّٰهُ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ' میں سمجھ گیا۔ میری مشکل حل ہو گئی۔ ایسے ہی نیٹشے کا فوق البشر زیر بحث آیا تو میں نے درخواست کی کہ اس باب میں دانستہ یا نادانستہ جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں یا کر دی گئیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ ناقدین نے فوق البشر کا سلسلہ خواہ مخواہ نائبِ حق سے جوڑ رکھا ہے۔ فرمایا میں تو ان کا کب سے ازالہ کر چکا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے میرے ناقدین اسے غور سے کیوں نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا میں انہیں کے خیال سے کچھ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان غلط فہمیوں کے پیش نظر چند ایک باتوں کی ایک حد تک وضاحت ہو جائے اور وہ بھی آپ کی طرف سے تو اچھا ہو گا۔ فرمایا اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو کل سہ پہر کا وقت مناسب رہے گا۔ ذرا جلدی چلے آنا۔ دوسرے روز حاضر خدمت ہوا۔ اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا تو فرمایا یہ سامنے کی الماری میں قرآن مجید رکھا ہے۔ قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ میں اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے شاید فلسفہ کی بعض کتابوں کی ورق گردانی کے لیے کہا جائے گا۔ میں قرآن مجید لے آیا تو ارشاد ہوا۔ سورۃ الحشر کا آخری رکوع نقل کر لو۔ رکوع نقل کر چکا تو پھر چند ایک عنوانات کے ماتحت یکے بعد دیگرے مختصراً کچھ شذرات لکھواتے گئے۔ یہ دن تھا جب میں پورے طور سے سمجھا کہ اقبال نے نائبِ حق کا جو تصور قائم کیا اس کی اساس

فی الحقیقت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تدبّر و تفکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ علم و حکمت اور فکر و فرہنگ کی ساری دنیا ہمارے سامنے ہو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ دنیا بتمام و کمال ہمارے سامنے آئے گی تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن مجید کا رشتہ علم و حکمت سے جس طرح قائم ہے اور علم و حکمت کا قرآن مجید سے اس کا سمجھنا بہت بڑی بات ہے۔ ایک روز گفتگو تھی کہ اس عہد نے جسے سائنس کا عہد کہا جاتا ہے، مذہب کے بارے میں بڑی بدگمانیاں پیدا کر دیں بلکہ اس کے خلاف ایک معاندانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ فرمایا یہ اس لیے کہ لوگ علم و حکمت کی صحیح روح سے واقف ہیں نہ قرآن مجید سے کہ اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ ارشاد ہوا اور انگریزی میں اسلام خلاصۂ کائنات ہے (EPITOME OF THE UNIVERSE) اور یہی رائے ہمارے علماء کی تھی۔ مگر یہ حقیقت جب ہی منکشف ہوگی جب ہم قرآن مجید میں تدبّر اور تفکّر سے کام لیں۔ قرآنِ مجید میں تدبّر اور تفکّر کیجیے تو علم و حکمت ہو یا کوئی اور صداقت ہمارا رشتہ آپ ہی آپ اس سے قائم ہو جائے گا۔ یہ جو اقبال کے اشعار میں تعلیماتِ قرآنی کی برجستہ اور بے ساختہ ترجمانی ہوتی رہتی تھی تو اسی تدبّر اور تفکّر کی بدولت۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآنِ مجید ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس میں تدبّر اور تفکّر کا عمل بھی ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔

حکم کو لیجیے تو اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اقبال کے نزدیک انسان کے لیے کوئی اساسِ فکر اور اساسِ عمل ہے تو قرآنِ مجید اور صرف قرآن مجید۔ حکم کے معنی بہت وسیع ہیں۔ یہ ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے مراد ہے ان سب اوامر و نواہی کی غیر مشروط پابندی جو از رُوئے معروف و منکر اور حرام و حلال شریعت نے ہم پر عائد کیے اور جن کی بجا آوری سے فرد کی سیرت اور جماعت کا کردار اسلام کے سانچے میں ڈھلتا ہے جو ہماری تعلیم اور تربیّت کا سرچشمہ اور اس عمارت کی اساس ہیں جسے اسلامی نظامِ حیات یا اسلامی طریقِ زندگی یا اصطلاحاً جو جی چاہے کہہ لیجیے اور جو ساری نوعِ انسانی کو ایک اصول اور قانون پر جمع کرتے ہوئے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جسے اس کی فطرت کہیے جسے خالقِ فطرت نے خود اس کے لیے تجویز کیا۔ مختصراً یہ کہ حکم کا تقاضا ہے اقامتِ دین۔ بالفاظِ دیگر اسلام کی ہر پہلو سے عملاً اور واقعۃً ترجمانی۔ لہٰذا اس معاشرے کی تعمیر جو وحدتِ بشری کی تمہید ہے اور جس کے لیے ایک آزاد اور با اقتدار، مخصوص و متمیز اور جداگانہ سیاسی

اجتماعی گروہ بندی ناگزیر ٹھہرتی ہے، جس کے بغیر ناممکن ہے فرد یا جماعت کی زندگی اسلام کے معیار پر پوری اترے۔ یہی وہ جدوجہد ہے جس میں چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری میں ہمارے ایمان اور صبر و استقامت کا امتحان ہوتا ہے اور جس کا، جب ارض پاک و ہند کی سیاست ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گئی، وقت آیا اور اقبال نے قوم کو یاد دلایا کہ ہم نہ بھولیں بحیثیت قوم ہمارا فریضہ کیا ہے، ہماری حیاتِ اجتماعیہ اور قومی تشخص کا راز کیا۔ لہٰذا اس مرحلے میں ہمارا موقف کیا ہونا چاہیے تو ان کی مخالفت میں غیروں کی طرف سے جو آواز اٹھی اس میں ایک حد تک اپنوں نے بھی حصّہ لیا۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر اسلام محض ایک عقیدہ نہیں کہ ہم نے اسے مانا اور اپنی ذاتی اور نجی زندگی سے باہر اس پر عمل سے کنارہ کش ہو گئے بلکہ ایک دستورِ حیات جس کے افہام و تفہیم کے لیے انبیاء علیہم السّلام تشریف لائے جو حضورؐ رحمۃ للعالمین کی بعثت کے ساتھ بطور ایک دینِ کامل افراد و اقوام کی زندگی لہٰذا امورِ انسانی میں ہمیشہ کارفرما تھا آج بھی ہے اور رہے گا اگر اس دستورِ حیات کی ترجمانی ایک نظامِ مدنیّت کی شکل میں نہیں ہوتی۔ اگر اس کی بنا پر ایک ایسی قوم وجود میں نہیں آتی جس کا ضمیر خالص انسانی اور نقطہ نظر لسانی، جغرافی، نسلی عصبیتوں سے بالاتر محض انسانیت پر مرکوز ہے تو کوئی بھی جدوجہد ہو سیاسی یا اجتماعی ذہنی یا اخلاقی اس سے کیا حاصل! یہ ایک سیدھی سادی سی بات تھی جس میں کوئی ایچ پیچ نہیں تھا مگر جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ اگر اسلام ایک عالمگیر دعوت ہے، اگر اس کا خطاب ساری دنیائے انسانی اقوام اور اُمم سے اور عالمِ تاریخ سے ہے لہٰذا کسی ایسے نصب العین پر جس سے بحیثیّت ایک نوع ہماری تقدیر اور مستقبل وابستہ ہے اور یہی فی الحقیقت تہذیب و تمدّن کی اساس۔ اگر مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کردار سے کوئی فریضہ ہے جو عالمِ بشری کی ہدایت اور خیر و سعادت کے لیے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے تو ہم اسے آزادی و اقتدار ایک قوم کی حیثیّت ہی سے جیسا کہ زبانِ سیاست میں اس کا مفہوم ہے اور جس کے لیے "خیرِ امت" کی تشکیل ہوئی ادا کر سکتے ہیں۔ نہ اسلامی قومیّت کسی دوسری قومیّت میں ضم ہو سکتی ہے نہ اس کے دستورِ حیات میں کسی دوسرے دستورِ حیات کا پیوند لگ سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے ہم اپنا ملّی تشخص قائم رکھیں۔ پھر جب اس ملّی تشخص کے شعور ہی سے ہماری تعلیم و تربیّت میں کچھ معنی پیدا ہوتے اور ہمارا قومی وجود قائم ہے تو حق و باطل

میں شرکت کے کیا معنی۔

باطل دُوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ فریضہ ہے جس کی انہوں نے عمر بھر تلقین کی جس کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی شعر ہو یا فلسفہ، ادب اور فن یا سیاسی اور ملی زندگی کا کوئی گوشہ وہ جہاں کہیں بھی اور جس حال میں تھے، اسی نصب العین پر قائم رہے اور یہی اوّل و آخر ان کی آرزو رہی کہ اُمّت اپنے اصل الاصُول پر آجائے۔ عصرِ حاضر کا انسان اپنی سعی و محنت، اپنی عقل و فکر کی تازگی اور علم و ہُنر کی نادرہ کاری سے جو دنیا پیدا کر رہا ہے، زندگی نے جو انقلاب انگیز کروٹ لی ہے، اربابِ نظر جس نئے اور تابناک مستقبل کا جو خواب دیکھ رہے ہیں مسلمان اس سے غافل نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک موقع دیا ہے اسی میں ان کا امتحان ہے۔ وہ اٹھیں، اپنے ایمان و یقین کی تجدید کریں اور اس دنیا کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں جو اسلام کا مقصود ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے دن گزرتے گئے ان کی گفتگو کا کوئی موضوع تھا تو یہی اور یہی ہر ایک سے ان کا کہنا تھا کہ علالت کے آخری ایّام میں جب ان کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں کوئی خیال تھا تو یہی کوئی پریشانی تھی تو یہی۔ چنانچہ یہ انہیں کا ایمان و یقین بصیرت اور فراست تھی کہ ارض پاک و ہند کی بساطِ سیاست دیکھتے دیکھتے بدل گئی۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

مسلمانوں نے جان لیا ان کے مستقبل کا راز کیا ہے، ان کے لیے صحیح راہِ عمل کیا۔

بات طویل ہو رہی ہے کہنا یہ ہے کہ اقبال کا کوئی پیغام تھا تو یہی کہ مسلمان سمجھ لیں ان کی زندگی قرآن مجید سے ہے۔ قرآن مجید میں فکر و نظر سے کام لیں۔ اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ قرآن مجید ہی ان کا ایک سرمایہ ہے۔ یہی ان کا پیغام تھا جسے انہوں نے طرح طرح سے پیش کیا شعر میں، فکر میں تحریر و تقریر میں، گفتگوؤں میں، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کوئی معاملہ ہو، کوئی مسئلہ، علم و حکمت کی بحث ہو، تہذیب و تمدّن یا ادب اور فن، سیاست اور معاش، فرد کی زندگی، جماعت کے مفاد، انسان، اس کے ضمیر اور باطن، احوال و واردات امورِ عالم کی غرضیکہ کوئی موضوع ہو بالآخر قرآن مجید ہی پر ختم ہوتا۔ قرآن مجید ہی نے ان کے فکر کو جلا دی۔ قرآن مجید نے ہی ان کی شاعری

میں وہ کیفیّت، وہ درد و سوز اور ذوق و شوق پیدا کیا جس کا سرچشمہ ایمان میں نے عرض کیا تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور اگر ہم نے اقبال کو سمجھ لیا ہے تو جیسا کہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اس تعلیم کا خاتمہ بھی قرآن مجید ہی پر ہوا۔ آخری عمر میں بھی ان کی کوئی خواہش تھی تو یہی کہ قرآن مجید کے معارف اور حِکَم پر قلم اٹھائیں۔ زندگی کے آخری لمحے آئے تو یہی آرزو کہ قرآن مجید سنیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ جب زندگی ہو یا آخرت اس کا رشتہ قرآن مجید ہی سے وابستہ ہے انہوں نے کہا ہے اور خوب کہا۔

گر تُو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن اس "بقرآن زیستن" کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس جد و جہد میں جو نوعِ انسانی کو ازل سے درپیش ہے، جس میں تاریخ کی حیثیّت ایک لمحے کی ہے، جس میں اقوام و امم یکے بعد دیگرے ایسے اُبھرتی ہیں جیسے کسی بہتی ہوئی ندی میں پانی کے بلبلے، جس میں تہذیب و تمدّن نے کئی رنگ بدلے، چشمِ فلک نے کئی انقلاب دیکھے اور جس کا سلسلہ اس لیے جاری ہے اور جاری رہے گا کہ انسان اپنے مدّعا و منتہا کو پالے، ہم اس جد و جہد میں مردانہ وار حصّہ لیں۔ اسے اسلام کے قالب میں ڈھال دیں۔ یہ مقصد وعظ و نصیحت اور تحریر و تقریر سے حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن مجید پر عمل کرنے سے

اے کہ می نازی بقرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

یہ اس لیے کہ زندگی کو ثبات ہے۔ اس کی تقویم کا کوئی نسخہ، اس کے امکانات کے حصول کا کوئی راستہ، اس کی غایت اور کنہ میں ادراک کا کوئی ذریعہ ہم سمجھ لیں اس کا رُخ فی الحقیقت کس طرف ہے تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ یہی ہماری تعمیرِ ذات اور یہی ایک ایسی زندہ و پائندہ شخصیّت کی اساس ہے جسے موت کا ہاتھ بھی فنا نہیں کر سکتا، قرآن مجید ہی اس حکم اور ترقی پذیر نظامِ تمدّن کا صورت گر ہے جس کی ساری نوعِ انسانی کو ضرورت ہے۔ وہ ایک عالمگیر اور ابدی پیامِ ہدایت ہے جو ہمارے لیے مژدۂ حیات لے کر آیا جس میں ہمارا ہی ذکر ہے، جسے یاد رکھنے کے لیے آسان کر دیا۔ "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ" جو عین صداقت ہے، عین علم و حکمت، سرتاسر دستور و قانون، سرتاسر موعظت اور رحمت!

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخرین　　حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمین!

اب اگر ہمیں زندگی کی نعمت ملی ہے، ہمارے نزدیک اس کے کچھ معنی ہیں، ہم اس کی تب و تاب محسوس کرتے، اس کے ذوق و شوق اور سوز و ساز کے لذّت آشنا ہیں، ہمارے سینوں میں بھی وہی آرزوئیں اور تمنائیں پرورش پا رہی ہیں، وہی عزائم اور مقاصد اُبھر رہے ہیں جن کا تعلّق جہاں داری اور جہاں بانی سے ہے، عالمِ محسوس کی تسخیر اور ایک برتر تہذیب و تمدّن کے نشو و نما سے، ایک ایسی دنیا کا تصور ہمیں جو عمل پر اُکسا رہا ہے جس میں انسانیت کا جوہر کھلے، جس میں زندگی کو اس کے سارے جمال و جلال کے ساتھ عالمِ خارج میں مشہود دیکھیں جس میں نت نئے حقائق اور نت نئے مدارجِ ذات سے لُطف اندوز ہوں تو اس میں کامیابی کا رشتہ قرآن مجید ہی سے جوڑنا پڑے گا۔ پھر اس باب میں اقبال کا خطاب اگرچہ ساری نوعِ انسانی سے تھا لیکن اس شخص سے بالخصوص جو مسلمان ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے کہ سب سے زیادہ اسی کا فرض ہے کہ اس جد و جہد میں حصّہ لے۔

چوں مسلمانان اگر داری جگر　　در ضمیرِ خویش و در قرآن نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　عمرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است　　گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن زِ آیاتِ خدا است　　ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قبا است
چوں کہف گردد جہانے در برش　　می دہد قرآں جہانے دیگرش
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ہم بھول گئے قرآن مجید ہی سے ہمارا قومی وجود قائم ہے۔ قرآن مجید ہی ہمارے ملّی تشخص کا راز، ہمارا آئین، ہمارے لیے اصول و قوانین کا سرچشمہ۔ مگر ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوۂ سنجِ گردشِ دوراں شدی

کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے۔ اُس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبۂ اختیار پر فائز کرنے کے لیے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے اسی طرح اسے غیر فانی بنانے کے لیے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبۂ بقا وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لیے جد و جہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار و اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالت کاوش پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوّف اس حالت کے لیے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالت کاوش برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک وقفۂ سکون ہو جسے قرآن شریف عالمِ برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدمہ صرف وہ افراد برداشت کر سکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو پختہ کر لیا ہوگا۔

اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ ولڈن کار نے لکھا ہے حشرِ اجساد بھی عین قرینِ عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے ہم اُسے مکان سے وابستہ کر سکتے ہیں اور اسی لیے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقیّد بالمکان زمانہ، اس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لیے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ دراصل ہم غیر زمانی ہیں۔ اور موجودہ مقیّد بالزمان زندگی میں بھی کبھی کبھی

اس سے اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اگر یہ بات کسی آئی ہوگا۔

خودی میں عشق سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کر دینا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شان انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔ جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات ہمیں ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ کے ترکہ سے دولت مند بنتا ہے وہ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدار فکر بناتا ہے وہ بھی سائل ہے ؎

خریدیں نہ جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح کرنا چاہیے؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لیے آنحضرتؐ کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" آپؐ نے اپنے طرز عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

ہر کہ عشق مصطفےٰ سامان اوست　　بحر و بر در گوشۂ سامان اوست

تربیت خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستور الٰہی کی اطاعت (۲) ضبط نفس (۳) نیابت الٰہی۔

نیابت الٰہی، دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے یعنی اس کی زندگی میں آ کر حیات اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور

علم جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لیے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں برمحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانۂ آئندہ میں افراد کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے ان کا صدر اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افراد یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔

(۲)

'اسرارِ خودی'
کے مباحث عالیہ کا مختصر خاکہ

مرتبہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

علامہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لیے اسرار خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱)　شاعری علامہ کے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعۂ اظہار خیالات ہے۔ لکھتے ہیں:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بت پرستی بت گری مقصود نیست[۱۲]

پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصور کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عروضی قواعد پر پرکھتے ہیں حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں "پیغام گو" ہے۔

(۲) خودی اصل نظامِ عالم ہے اور تسلسلِ حیات استحکامِ خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" موجود ہے۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است پس بقدرِ استواری زندگی است[۱۳]

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند[۱۴]

(۳) خودی کی حیات و بقا، تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است[۱۵]

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات[۱۶]

زندہ را نفیٔ تمنا مردہ کرد شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد[۱۷]

علم از سامانِ حفظِ زندگی است علم از اسبابِ تقویمِ خودی است[۱۸]

(۴) خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

از محبت می شود پایندہ تر زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر[۱۹]

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست[۲۰]

خاک نجد از فیضِ او چالاک شد آمد اندر وجد و بر افلاک شد[۲۱]

(۵) عشق کا طریقہ محمد عربیؐ سے سیکھنا چاہیے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است[۲۲]

آنکہ بر اعداء درِ رحمت کشاد مکہ را پیغامِ لا تثریب داد[۲۳]

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت[۲۴]

چوں گلِ صد برگ ما را بو یکیست اوست جانِ ایں نظام و او یکیست[۲۵]

(۶) بغیر آپؐ کی اتباع کے خودی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار تا کمندِ تو کند یزداں شکار[۲۶]

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا شرحِ اِنّی جاعلٌ سازد ترا[۲۷]

(۷) خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہو جاتی ہے اور ترقی نہیں کر سکتی۔

خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ الحذر از منّتِ غیر الحذر[۲۸]

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو موجِ آب از چشمۂ خاور مجو[۲۹]

تا نباشی پیشِ پیغمبرؐ خجل روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل[۳۰]

ہمّت از حق خواہ و با گردوں ستیز آبروئے ملّتِ بیضا مریز[۳۱]

(۸) جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کو مسخر کر لیتی ہے۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشتِ او شق می شود[۳۲]

در خصوماتِ جہاں گردد حکم تابعِ فرمانِ او دارا و جم[۳۳]

(۹) مسئلہ نفیٔ خودی اقوامِ مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوامِ غالبہ کے قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں اس لیے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ یہ مسئلہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔

صد مرض پیدا شد از بے ہمّتی کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی[۳۴]

(۱۰) افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترکِ عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لیے مضر ہے۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود جانِ او وارفتۂ معدوم بود[۳۵]

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیانِ نامشہود گشت[۳۶]

قومہا از مسکرِ او مسموم گشت خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت[۳۷]

(۱۱) "حیاتِ اسلامیہ بھی مثل دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں۔ شعراء اور ادباء کو چاہیے کہ ایسے مضامین پر قلم کریں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں حرکت پیدا ہو۔

اے میاں کیست نقدِ سخن — بر عیارِ زندگی او را بزن[۳۸]
فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است — چوں درخشد برق پیش از تندر است[۳۹]
فکرِ صالح در ادب می بایدت — رجعتے سوئے عرب می بایدت[۴۰]

(۱۲) تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہیہ۔

(ا) اطاعت

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار[۴۱]
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی — تو چرا غافل زایں ساماں روی[۴۲]
شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو — از حدودِ مصطفٰے بیروں مرو[۴۳]

(ب) ضبطِ نفس

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں — می شود فرماں پذیر از دیگراں[۴۴]
تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست[۴۵]
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد — فارغ از بندِ زن و اولاد شد[۴۶]
می کند از ما سوٰی قطعِ نظر — می نہد سا طور بر حلقِ پسر[۴۷]

(ج) نیابتِ الٰہی

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیٔ او ظلِّ اسمِ اعظم است[۴۸]
از رموزِ جزو و کل آگہ بود — در جہاں قائم بامر اللہ بود[۴۹]
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر — ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر[۵۰]
مدّعائے علّم الاسمائے — سرِّ سبحان الّذی اسرائے[۵۱]
ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است — از جلالِ او نجاتِ ما است[۵۲]

(۱۳) حیاتِ ملّی کا تسلسل روایاتِ قدیمہ کی حفاظت و مداومت پر موقوف ہے جو قوم اپنی ملّی روایات سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اپنی قدیم روایات پر قائم رہنا چاہیے۔

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن — پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن[۵۳]

(۱۴) مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصود اگر تسخیرِ ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است — مسلم ار عاشق نباشد کافر است[۵۴]
تابعِ حق دیدنش نادیدنش — خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش[۵۵]
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار — تا ز تو گردد جلالش آشکار[۵۶]
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید — تیغِ او بر سینۂ او آرمید[۵۷]
زندگی از طوفِ دیگر رستن است — خویش را بیت الحرم دانستن است[۵۸]

(۱۵) موجودہ عقل و خرد اور تہذیب در اصل جہالت اور سفاہت ہے۔ مسلمانوں کو اس مادّی تمدّن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لیے کمزور ہے۔

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است — معنیٔ اسلام ترکِ آفل است[۵۹]
سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے — کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے[۶۰]
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است — بُت پرست و بُت فروش و بُتگر است[۶۱]

(۱۶) وقت (TIME) پر وہی شخص حکمران ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ چنانچہ مرشد رومی کہتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را — اوست سیّد جملہ موجودات را[۶۲]

امام شافعیؒ نے وقت کو سیف قاطع قرار دیا ہے۔ وقت در اصل حیات ہے اور کوئی

شخص حیات کو وقت سے جدا کر کے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم سرِ ایں شمشیر چیست آب او سرمایہ دار از زندگیست[۶۳]
پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود قوتِ او از ہمیں شمشیر بود[۶۴]
تو کہ از اصلِ زماں آگہ نۂ از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ[۶۵]
زندگی از دہر و دہر از زندگی است لاتسبو الدہر فرمانِ نبیؐ است[۶۶]
نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت[۶۷]

(۱۷) آخر میں علامہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ:۔

(ا) عشق را از شغلِ لا آگاہ کن آشنائے رمز الا اللہ کن[۶۸]

(ب) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے یعنی محمل تو ہے مگر لیلیٰ نہیں ہیں مثل شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں پس اے خدایا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے ایک ہم دم عطا کر۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے از رموزِ فطرت من محرمے[۶۹]
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش باز بینم در دلِ او روئے خویش[۷۰]

****

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآرا تصنیف

مرجّحہ نظام زمینداری اور اسلام

عمدہ سفید کاغذ، دیدہ زیب طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد

قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

ملّتِ اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاصۂ رموزِ بے خودی

مرتبہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

جس طرح خودی کے معنی تکبر یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۱) رابطۂ فرد و ملّت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوا جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں "شیطان جماعت سے دُور رہتا ہے"۔

فرد می گیرد ز ملّت احترام ملّت از افراد می یابد نظام[۷۱]

فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جملہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد شعلہ ہائے نغمہ در عُودش فسرد[۷۲]

انسان کے اندر "جوہرِ نوری" ہے۔ قوتِ ادراک اُسی کی ایک شعاع ہے۔ اس کی ترقی جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است جزو او را قوتِ کل گیری است[۷۳]
در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گلبرگے چمن گردد خودی[۷۴]

(۲) ملّت اختلاطِ افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوّت سے ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف الخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کر کے قوم بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم بنا دیا اور عربوں کو سرکارِ مدینہؐ نے

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است ہستیٔ کوکب ز کوکب محکم است[۷۵]

نبیؐ افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ زیں بتان بے زبان کمتر نۂ[۷۶]

اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تا سوئے یک مدعایش می کشد حلقۂ آئیں بپایش می کشد[۷۷]

نکتۂ توحید باز آموز دش رسم و آئینِ نیاز آموز دش[۷۸]

(۳) ارکانِ اساسی (BASIC PRINCIPLES OF ISLAM)

(ا) اسلام کا رکنِ اوّل توحید ہے۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔

عقلِ انسانی اسی توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحل کہاں مل سکتا ہے۔ مومن میں دین، حکمت، آئین، زور، قوت اور تمکین سب توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلم حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیرِ کائنات[۷۹]

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[۸۰]

ملّتِ اسلامیہ کے لیے توحید بمنزلۂ روحِ رواں ہے۔ اگر توحید کا تصور خارج کر دیا جائے تو ملّتِ اسلامیہ لاشۂ بے جان رہ جائے گی۔

ملّتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ[۸۱]

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[۸۲]

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لیے ملّتِ اسلامیہ کا مقصود بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔

ملّت از یک رنگیٔ دلہاستے روشن از یک جلوہ ایں سیناستے[۸۳]

قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدّعا باید یکے[۸۴]

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

بر نسب نازاں شدن نادانی است حکمِ او اندر تن و تن فانی است[۸۵]

ملتِ ما را اساسِ دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است[۸۶]

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم[۸۷]

(۳) ب: یاس و حزن و خوف اُمّ الخبائث ہیں اور حیات کے دشمن ہیں۔ توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی نا اُمید نہ ہو کیونکہ نا اُمیدی حیات کے لیے سامانِ مرگ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تعلیمِ لَا تَحْزَنْ بگیر[۸۸]

قوتِ ایماں حیات افزایدت وردِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ بایدت[۸۹]

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است کاروانِ زندگی را رہزن است[۹۰]

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست اصلِ او بیم است اگر بینی درست[۹۱]

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است[۹۲]

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس[۹۳]

(۴) رکنِ دوم رسالت: جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان بر رسالت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے سے تنِ مردہ میں جان آجاتی ہے اور دین و آئین کی بنیاد رسالت ہی ہے۔ رسولؐ مسلم کے قلب و جگر کی قوت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے۔

سرکارِ مدینہ نے ہمیں دینِ حق اور مذہبِ فطرت عطا کیا اور اس لیے کہ ہماری وحدت میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہو جائے۔ خدا نے ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کر دی۔

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ از خدا محبوب تر گردد نبیؐ[۹۴]

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم در رہِ حق مشعلے افروختیم[۹۵]

لَانَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسان خداست پردۂ ناموسِ دینِ مصطفٰےؐ است[۹۶]

(۴) ب: رسالتِ محمدیؐ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت و اخوت و مساوات قائم ہو جائے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو حریت و اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔

کُلُّ مُؤمِنٌ اِخوَۃٌ اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گلش[۹۷]

ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ[۹۸]

اس کے بعد علامہ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں۔ حریت کی مثال میں امام حسینؓ کی شہادت پیش کی ہے۔

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است[۹۹]

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست[۱۰۰]

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم[۱۰۱]

رمزِ قرآن سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

(۵) چونکہ ملتِ محمدیؐ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ حقائق محدود فی المکان نہیں ہیں اس لیے ملتِ محمدیؐ بھی محدود فی المکان نہیں۔ اس لیے:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مسلم استی دل باقلیمے مبند گم مشو اندر جہانِ چون و چند[۱۰۲]

دل بدست آور کہ در پہنائے دل می شود گم ایں سرائے آب و گل[۱۰۳]

آنحضرتؐ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ مدینہ کو وطن بنا لیا جو آپؐ کا جائے ولادت نہیں تھا یعنی تمام دنیا مسلمان کا وطن ہے اور تمام زمین

اس کے لیے مسجد ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است[۱۰۴]

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو[۱۰۵]

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد چوں فلک در شش جہت آباد شد[۱۰۶]

(۶) وطن اساسِ ملت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کے لیے ازبس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوت کا زریں اصول تباہ ہو جاتا ہے جو لوگ ملت کی تعمیر وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوعِ انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہنگامہ بپا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساسِ ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

تا سیاست مسند مذہب گرفت ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت[۱۰۷]

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شد و اقوام ماند[۱۰۸]

(۷) جس طرح ملت محمدیؐ محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقید بالزمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہو جاتی ہے لیکن ملتِ محمدی اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

امتِ مسلم ز آیاتِ خداست اصلش از ہنگامہ قَالُوا بَلٰی ست[۱۰۹]

از اجل ایں قوم بے پرواستے استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا ستے[۱۱۰]

تا خدا اِنَّ لَحٰفِظُوْنَ فرمودہ است از فسردن ایں چراغ آسودہ است[۱۱۱]

(۸) نظامِ ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور اس لیے خدا نے نظامِ ملت کے قیام و ثبات کے لیے قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنا ملی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستورِ حیات اور ضابطۂ عمل بنانا چاہیے۔

ہستیِ مسلم ز آئین است و بس باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس[۱۱۲]

آں کتابِ زندۂ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم[113]
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے[114]
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ او رحمۃٌ لِلعالمیں[115]

اس کے بعد علامہ نے مسلمِ سست پیما سے خطاب کیا ہے اور دو لفظوں میں رازِ حیات بیان کر دیا ہے۔

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو شیوہ ہائے کافری زنداں تو[116]
قطع کردی امرِ خود را در زُبَر جادۂ پیمائی الیٰ شَیءٍ نُکَر[117]
گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن[118]

(۹) انحطاط کے زمانہ میں تقلید کرنا اجتہاد کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ یہاں تقلید کے معنی فقہی نہیں ہیں بلکہ روایاتِ ملّی پر عامل ہونے کے ہیں۔ علامہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اگر تقلید بودے شیوۂ نیک چرا ہم رہِ اجداد رفتے[119]

یعنی تقلید کو بُرا بتایا ہے۔ اس جگہ تقلید کو اجتہاد سے اولیٰ تر قرار دیا ہے پس معلوم ہوا کہ وہاں تقلید کے معنی کورانہ پیروی کے ہیں اور یہاں تقلید کے معنی اپنی ثقافتی روایاتِ ملّی (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور ان پر عمل کرنا ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیّت است معنیٔ تقلید ضبطِ ملّت است[120]

اس شعر میں خود بھی تقلید کے معنی صاف کر دیتے ہیں۔

نقش بر دل معنیٔ توحید کن چارۂ کارِ خود از تقلید کن[121]
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط[122]
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر[123]
از یک آئینی مسلماں زندہ است پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است[124]
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست[125]

الغرض تقلید کے معنی ہیں قرآنی احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرنا اور یک آئینی کو اپنا نصب العین بنانا۔ سنّتِ نبویؐ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔

(۱۰) اتباعِ آئینِ الٰہیہ سے سیرتِ ملّی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تراشا ہے۔ اس میں سراسر نور اور روشنی ہے اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علمِ حقیقت شریعت سے جُدا نہیں ہے اور سنّت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ سے محبّت کی جائے۔ "ہر کہ عشقِ مصطفیٰ الخ" اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباعِ شریعت کریں۔ ملّت کا نظام اتباعِ شریعت پر مبنی ہے۔ جب یہ نظام محکم ہو جاتا ہے تو ملّت کو دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" SECRET پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوّت اتباعِ شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔

سرّ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست؟ زیستن اندر خطرہا زندگیست[126]

آنحضرت صلعم کا دین زندگی بخشنے والا دین ہے۔

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات شرعِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات[127]

جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبویؐ سے رُوگردانی کی رمزِ لِقا سے محروم ہو گئے۔

تا شعارِ مصطفیٰ از دست رفت قوم را رمزِ لِقا از دست رفت[128]

آخر میں نصیحت کی ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدودِ اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیے۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر از خیالاتِ عجم باید حذر[129]
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گذشت[130]
قلب را زیں حرفِ حق گرداں قوی با عرب در ساز تا مسلم شوی[131]

(۱۱) سیرتِ قومی میں اتباعِ رسولؐ سے حسن و خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرشد رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

مگسل از ختم الرسلؐ ایامِ خویش تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش [۱۳۲]

مسلمانوں کے لیے حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات ستودہ صفات بہترین نمونہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رہنما بنانا کارِ نادانی ہے۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ [۱۳۳]

از بہارش رنگ و بو باید گرفت بہرۂ از خلق او باید گرفت [۱۳۴]

آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم [۱۳۵]

از مقامِ او اگر دور ایستی از میانِ معشرِ ما نیستی [۱۳۶]

(۱۲) حیاتِ ملیہ کے لیے ایک مرکزِ محسوس بھی اشد ضروری ہے اور مسلمانوں کا مرکز بیت الحرام ہے۔ سب مسلمانوں کو اس سرزمین کو اپنا مرکز یقین کرنا چاہیے۔ مکہ واقعی ہمارا کعبۂ مقصود ہے اور جسے مکہ سے محبت نہیں اس کے ایمان میں خلل ہے جو جماعت مکہ کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین کو اپنا مرکز قرار دے وہ اسلام سے خارج ہے۔

ہم چناں آئینِ میلادِ اُمم زندگی بر مرکزے آید بہم [۱۳۷]

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے [۱۳۸]

راز دارو رازِ ما بیت الحرام سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام [۱۳۹]

در جہاں مارا بلند آوازہ کرد با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد [۱۴۰]

(۱۳) تنظیمِ حقیقی کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ افرادِ ملت کے سامنے کوئی نصب العین ہو اور ہر فرد اس کے حصول میں منہمک ہو اور امتِ محمدی کا نصب العین یہ ہے کہ توحید کی حفاظت اور اشاعت کی جائے گویا ہر مسلمان مبلغ اسلام ہے۔

مدعا رازِ بقائے زندگی جمعِ سیماب قوائے زندگی [۱۴۱]

ان شاء اللہ العزیز وبعونہ تعالےٰ

انجمن خدام القرآن کے قرآنی محاضرات کے ساتھ ساتھ

ریکس آڈیٹوریم کراچی میں ۱۷ تا ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

تنظیمِ اسلامی کی مرکزی تربیت گاہ

بھی منعقد ہوگی۔ جس میں

★ قرآن حکیم کے دعوتی اور تربیتی نصاب اور

★ تزکیۂ نفس کے اصول و مبادی کے علاوہ

★ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق و منہاج اور

★ دعوت و تنظیم کی راہ کی مشکلات اور اُن کا حل

ایسے اہم موضوعات پر مذاکرات ہوں گے

تنظیمِ اسلامی کے رفقاء ابھی سے رخصت وغیرہ کا بندوبست شروع کر دیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۷ دسمبر ۸۸ء کی سہ پہر تک ضرور کراچی پہنچ جائیں۔ وہاں سے واپسی کے لیے جمعرات ۲۲ دسمبر کی بعد دوپہر بکنگ کرائی جائے۔ قیام گاہ وغیرہ کے ضمن میں تفصیلی اطلاع 'میثاق' کے آئندہ شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔

المعلن: (میاں) محمد نعیم، ناظمِ اعلیٰ، تنظیمِ اسلامی پاکستان

۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

(فون:۔ ۳۰۵۱۱۰)

NOVEMBER 1988 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 7
NO. 11

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلۂ اقبالیات میں لقاءت کبریٰ و بے قیمت ہیرے کی مصداق کامل
قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

عنوانات: مصورِ پاکستان ، قافلۂ حق کا حادیٔ خواں
روحِ ثانی ، عظمتِ قرآن کا نشاں
واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن ——— اور
داعیٔ الی القرآن

قیمت فی نسخہ: صرف تین روپے

شائع کردہ
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶ کنگ ماڈل ٹاؤن ٹیلی فون: ۸۵۶۰۰۴